''میں بنتِ جمیلہ''

''اور یہ دینا کی ہوگی جرور..... ماں جئی..... بالکل ماں جئی.....

میں اپنی ہم عمر کسی لڑکی کے ساتھ نیاز کے چاول بانٹتی پھر رہی تھی۔ بڑھیا نے چندھی آنکھوں سے مجھے گھورا اور کہا۔

ایسا ہمیشہ ہوتا میری شکل میرا تعارف خود کروا دیتی۔ میری ماں کا پتا بتا دیتی۔ وہ ماں جو خود اپنا پتا کھو چکی تھی اور ابا کے گھر میں لاپتہ ہوئی پھرتی تھی۔ میں اس جیسی ہرگز نہیں تھی کیونکہ میں باپ کے گھر سے بھاگ گئی اور شوہر کے گھر کو لات مار آئی۔ میں ماں جئی کیسے ہوئی؟

''پر دینا تو دُودھ ملائی تھی..... حور پری..... یہ لمبے کال سیاہ بال.....''

یعنی میں ماں جئی تھی لیکن دودھ ملائی نہ تھی۔ دادی جواب مرکھپ گئی کہتی تھی کہ جب تو پیدا ہونے والی تھی تو اوپر تلے تیرے نانا نانی مر گئے تھے۔ تیری ماں نے وہ سوگ منایا کہ مُنی کا رنگ روپ کھال بال سب کھا گئی.....''

منی کون میں۔ ساری عمر کاکی' اے چھوکری' سن مرن جوگی' کہہ کر بلاتی رہی۔ اماں کو اوقات دکھانی ہوتی تو مُنی بنا دی جاتی۔ ویسے میری دادی ایک ایسی ساس تھی جو بہو کو جھنال مانتی' حرام کار سمجھتی' اور کمینی لچی کہہ کر بلاتی۔

ایسی جھنال بہو کی لچی اولاد کو انہیں ایک بار سنبھالنا پڑ گیا۔ وہ ہمیں مار مار کر سوکھی روٹیاں کھلا رہی تھی۔ جو ہمارے حلق سے نیچے نہیں اتر رہی تھیں۔

''دُرفٹ! ماں تو شاہی لونڈی بنی ٹھسے سے میکے بیٹھی ہے اور میں یہ اودھ بلائیں پالنے کو رہ گئی ہوں۔''

شاہی لونڈی اماں! خون بھرے جبڑوں اور سوجے ہوئے ہاتھ' منہ' پیر لے کر میکے گئی تھی کہ دو دن ابا بچوں کو رکھیں گے تو لگ پتہ جائے گا۔ پر پتا تو اماں کو لگ گیا۔ جب مہینوں بعد بھی ابا اسے لے کر نہ آئے۔ خود ہی واپس آ گئی۔ پھر دوبارہ کبھی نہیں گئی۔ بڑی پاگل تھی اماں جانا ہی تھا تو آئی کیوں۔ آنا ہی تھا تو گئی کیوں؟ کوئی ایک فیصلہ کرتی اور جی جان لگا کر نبا ہتی۔ بلکہ جان دے کا نبھاتی۔ یہی وہ حرکتیں تھیں جو اماں کو لے ڈوبیں۔ اسے ساگ کا ڈنٹھل بنا دا تر سے گردن کٹوا بیٹھیں۔ ویسے اماں سے اچھے تو ڈنٹھل ہی ہیں جو کم سے کم ''ڈنگروں'' کے کام تو آتے ہیں۔ اماں تو کسی کام جوگی نہ تھی۔ نہ ہمارے نہ ابا کے۔ خود اپنے لیے تو بالکل ہی ''درفٹ'' تھی۔

ہاں تو جب تک دادی زندہ رہی (خیر سے بہت دیر تک زندہ رہی) اماں کا غصہ' گالیاں' دو ہتڑ' چھتر' طعنے' کوسنے' ماں جئی کو بھی ملتے رہے (اماں کا حصہ الگ سے)۔

''اے ہندنی درفٹی کھول اسے۔''

میں دادی کی چارپائی کے نیچے سے اپنی جوتی نکال رہی تھی کہ دادی نے ذرا جھک کر میری چوٹی پکڑ لی۔ اور زور زور سے جھٹکے دینے لگی۔ ہندوؤں سے انہیں خاص خار تھی۔ نہ جانے کوئی ہندوان کا لوٹا لے کر بھاگ گیا تھا یا انہیں بھگانا بھول گیا تھا۔ وہ خود تو بسے بسائے پنجاب میں پاکستانی بن کر بیٹھ گئی تھی۔ نہ بارڈر پار کیا' نہ بلوائیوں کو بھگتا' نہ کسی ہندو کے لیے اپنا گھر بار چھوڑا۔ پھر بھی دل میں عناد کا کھیت

اگا لیا۔ساری نفرت اور غلاظت ہندوؤں کے نام کر دی تھی۔

''اتنی اونچی چوٹیاں نیچ ذات کی لونڈیاں بناتی ہیں۔مسلمان عورتیں یوں سروں پر لومڑیوں کی طرح دُمیں لٹکائے نہیں پھدکتیں.....''

اب مجھے کیا معلوم نیچ ذات کی لونڈیاں کیا کیا کرتی رہی تھیں۔میں تو اونچی ذات کی دادی کو جانتی تھی جو ایک جھنال کی ساس اور اس کی لچی اُولاد کی دادی تھی۔مسلمان عورتیں بھی میری نظر سے دو ہی گزری تھیں۔ایک اپنی دادی کو جو روز مردہ ماں کی زندہ لاش پر دولتی مارتی۔اور ایک اپنی ماں کو جو سانس لیتی' بھاگتی دوڑتی' ان دولتیوں کو کھاتی۔

''یہ سوانگ کنہیں رجھانے کے لیے رچاتی ہو.....مردود نیوں.....یہ بلاوے کن کے لیے ہیں.....''

وہ میرے بال کھول کھال جھٹکے دیے جا رہی تھی۔اور منہ اندر کی طرف کر کے اماں کو سنا رہی تھی۔اماں بھی کبھی کبھار ایسی ہی اونچی چوٹی بناتی تھی۔ویسے اماں یوں چوٹی نہ بھی بناتی تو بھی وہ نچلی سے نچلی ذات کی ہی رہتی.....لونڈی.....مردود نی.....

''کیسا پیارا دین ہے ہمارا۔اس دین سے کوئی بات تو سیکھو۔دُرفٹ.....اجڑ گئیں پاک دامن بیبیاں اور ڈیرے جما لیے ان حرامنوں نے۔غلافوں میں لپیٹ کر رہنے کو تو جی ہی نہیں چاہتا ان کا۔بس نہیں چلتا کہ اپنی کھالوں سے بھی باہر نکل آئیں اور چلا چلا کر کہیں کہ آؤ ہمیں دیکھو.....کرو نظارہ ہمارے حسن کا.....انگ انگ دیکھو ہمارا.....ہاں دیکھو ان کم ذاتوں کو' کھوٹھے والیاں' رجھانے والیاں' منڈیوں والیاں۔''

اب دادی سب ''والیاں'' گنوا کر ہی چپ ہونے والی تھی۔اندر سے اماں نکلی۔میرا ہاتھ پکڑا' بال سنوارے اور پڑھنے کے لیے بیٹھا دیا۔میری اماں کی قسمت اچھی تھی کہ وہ حاجی شوہر اور حاجن ساس کی بہو بن گئی تھی۔جبکہ میری دلاری دادی کی قسمت خراب تھی کہ وہ ایک نوعمر شہری لڑکی بیاہ کر لے آئی تھی اور میری اماں منحوس' کم بخت ماری بیاہ کر آ بھی گئی۔ویسے بھی اماں لکیر کی فقیر تھی۔لکیر جو ابا نے کھینچ دی اور فقیر اماں نے خود کو خود بنا لیا۔سر پر اُڑے اُڑے چیدہ چیدہ بال' کہیں کہیں سے نظر آتی کھال اور ہاتھ.....توبہ استغفار.....بھدے' بدصورت' لعنتی ہاتھ۔ہابیل جیسے نہیں جس نے پہلا انسانی قتل کیا تھا' قابیل جیسے۔وہی پہلے ہاتھ' ظلم کو روک نہ سکنے والے' خود کو قتل ہو جانے والے۔جو نہ خود کو ''بچاتے'' ہیں نہ ''چھپاتے'' ہیں۔نہ وار کر پاتے ہیں نہ حملہ روک پاتے ہیں.....یہی پھٹکارے ہوئے ہاتھ.....

اسی لیے دادی کہتی ''دُرفٹ! میں تو شیر کے لیے چھچھوندر لے آئی۔''

میں نے اماں سے پوچھا۔''یہ چھچھوندر کسے کہتے ہیں تو جھٹ بولی ''مجھے۔''

لو اماں تو چھچھوندر نکلی اور دادی کی قسمت خراب۔ٹھیک کہتی تھی دادی۔جب ابا گھر آتے سو شیر ساتھ لاتے۔محلے اور کھیل کے میدان کے سب ہی بچوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ ان کا ابا شیر ہے شیر۔جب میں اور میری سہیلیاں کھیلتے تو سب کو معلوم ہوتا کہ ساتھ ساتھ یہ پاس والی سڑک پر نظر رکھنی ہے۔جمیلہ کے ابا کی اسکوٹر نظر آتے ہی اسے جھٹ سڑک پار کروا کر پچھلی گلی کے پچھلے دوازے سے اندر کرنا ہے۔اسی میدان کے دوسری طرف عقیل اور شکیل کھیل رہے ہوتے۔شکیلہ جسے دادی نے ذرا سا قد نکلنے پر زبردستی آپا بنا دیا تھا ساتھ والوں

کی چھت پر کھیل رہی ہوتی۔ ہر ایک پر فرض تھا کہ جو پہلے ابا کو دیکھ لے گا وہ سب کو اطلاع دیتا ساتھ لے کر گھر پہنچے گا۔ یہ سب جذبہ بھائی چارہ کے تحت نہیں بلکہ باہمی مار سے بچاو کے تحت کیا جاتا تھا۔ پکڑا ایک جاتا یا دو' مار بہر حال مشترکہ سب کو پڑتی۔ پوری طرح پڑتی' مکمل طور پر پڑتی۔ ابا دل لگا کر مارتے بے شک کتنے بھی تھکے ہوئے ہوتے۔ مار مار کر ابا ہمیں قبر تک ہی کیوں نہ پہنچا دیتے اماں ہمیں نہیں بچاتی تھی۔ ویسے بھی اماں نے ہمیں بچانے کے لیے ہاتھ بڑھایا نہیں۔ یا زبان ہلائی نہیں کہ ان کے ہجرتی اماں باوا کو وہ ماں بہن کی گالی ملتی کہ اماں منہ چھپا چھپا کر روتی۔ اور اماں کو آتا ہی کیا تھا۔ اگر اماں گالی دینے والی زبان نہیں کھینچ سکتی تھی تو گالی سننے والے کان ہی کچل ڈالتی پھر یوں رونا تو نہ پڑتا۔

سنا تھا کہ جو چیز جتنی پرانی ہوتی جاتی ہے اس کی قدر اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔ اماں کی قدر الٹا گھٹتی جا رہی تھی۔ بلکہ اتنی گھٹ گئی تھی کہ ٹیکسال بھی اماں کو شرمندہ کر دے کہ جا بہن تیرے ''دام'' کا کوئی سکہ نہیں بن سکتا۔ نہ ابھی نہ کبھی۔ تیری قیمت ہی کیا ہے جو ''سکہ'' بنے۔ اسی لیے تو اماں مجھے کبھی پسند نہیں رہی..... بھلا کیا فائدہ ایسے انسان کا جسے وقت پڑنے پر بیچا جائے تو دمڑی بھی ہاتھ نہ آئے۔

عقیل شکیل تو تھوڑے بڑے تھے پر میرا گڈا جسے میں سارا وقت کمر پر ٹکائے پھرا کرتی تھی بمشکل بھاگنے دوڑنے لگا تھا کہ ابا نے باہمی مار میں اسے بھی رگڑ دیا۔ میں اسے بھی میدان میں اپنے ساتھ کھیلنے کے لیے گئی تھی نا۔ بے چارہ! سرکاری ہسپتال کے ڈاکٹروں نے کہا پیٹ کی کوئی آنت پھٹ گئی ہے۔ خون رسنا بند ہی نہیں ہو سکا اس کا۔ نو ماہ تک پاخانے میں خون آتا رہا۔ پھر وہ ہمیشہ کے لیے ٹھیک ہو گیا..... بھلا چنگا..... خوش باش..... مرحوم جلیل ولد حاجی ستار احمد.....

خیر ہمیں کیا۔ ہم سب تو کئی دن تک یہ ماتم کرتے رہے کہ وہ اتنا ''خوش قسمت'' کیوں رہا۔ اتنا خوش قسمت کہ اب اسے یہ سننا نہیں پڑے گا کہ ''تیرا باپ کنجر قبر میں لیٹا موت رہا ہے اور تجھ کنجری کو میرے سر پر ناچنے کے لیے چھوڑ گیا۔''

''اماں کا ابا کنجر تھا۔'' آپا پوچھتی۔ ویسے آپا تھی بڑی بھولی۔

''کنجر کسے کہتے ہیں۔'' عقیل نے آپا کی طرف دیکھا۔ میں نے دونوں کی طرف۔

دادی سے نہ پوچھ آئیں؟ شکیل نے مشورہ دیا اور یہ شکیل تھا بھی پاگل۔ ایک بار اس کے ہم جماعتوں کے والدین آ گئے اسکول اس کی شکایت لے کر۔

''یہ کن بازاری لوگوں کے بچے پڑھاتے ہو آپ۔ توبہ اتنی گندی باتیں۔ اتنی گندی گالیاں' اتنے سے بچے کہاں سے سیکھتے ہیں یہ۔''

اس دن اماں نے پہلی بار شکیل کی خوب پٹائی کی۔ اُس اماں نے جو کائی لگے گھڑے کا بدبودار پانی تھی۔ جسے پیاس میں پیا جا سکتا نہ احترام میں.....

☆ ☆ ☆

دادا کو اللہ جنت میں بڑے سے بڑے محل میں رکھے۔ دادی کو بٹھائے ایک بار سائیکل پر لیے جا رہے تھے کہ سامنے سے آتی گھوڑا

گاڑی نظر نہیں آئی۔خود وفات پا گئے اور دادی کی آدھی ٹانگ ساتھ لے گئے۔ان ڈیڑھ ٹانگوں کے ساتھ دادی گھر میں ایسے اور اتنے دھمال کرواتی تھی کہ میں سوچتی ہوں دو ٹانگوں کے ساتھ کیا کچھ نہ کرتی۔ویسے دادی بھی گیدڑوں کے سامنے ہی شیر تھی۔پھوپھا کے سامنے تو دم کٹی چھپکلی بن جاتی۔

پھوپھا اور ابا کی بنتی نہیں تھی۔عمر بھر کا مرنا جینا ختم تھا۔لاہور کی کسی شادی میں پھوپھی آئی تو چپکے سے دادی سے ملنے آ گئی۔اگلے دن اسی شادی میں ہم سب بھی شریک تھے۔میں نے پھوپھا کو سلام کیا اور پوچھ لیا ''آپ کل پھوپھی کے ساتھ گھر کیوں نہیں آئے۔''

شادی والے گھر میں جو پھوپھی کے ساتھ ہوئی وہ الگ' اور جو میرے ساتھ میرے گھر میں ہوئی وہ الگ۔اس ساری رات اماں میرے سرہانے بیٹھی رہی۔نہ پچکارا' نہ دلار کیا' بس بیٹھی مجھے گھورتی رہی' گھورتی رہی۔جیسے یا خود مرنے والی ہوں یا مجھے مار دینے والی ہوں۔ویسے اماں میں ٹھیک سے زندہ رہنے کی طاقت نہیں تھی ''زور لگا کر مرتی یا مارتی کیا''۔بس بد دعا ہی تھی اماں ہم سب کے لیے۔خود اپنے لیے تو سب سے پہلے تھی اور سب سے زیادہ تھی۔

پھوپھا پھر کئی بار مجھے خاندان میں آتے جاتے نظر آئے مگر دوبارہ ان پر سلامتی بھیجنے کی میں نے غلطی نہیں کی۔جب ان کے بیٹے کے ساتھ آپا کا رشتہ پکا ہو گیا تب بھی۔نہ جانے پھوپھا رشتہ کیسے لے گئے آپا کا۔دادی پھولی نہیں سماتی تھی کہ بیٹی اور داماد گھر آنے جانے لگے ہیں۔ملنے ملانے لگے ہیں۔آپا دنوں میں سوکھ کر تیلی سی بن گئی۔اماں نے قسم کھا رکھی تھی کہ بیٹیوں کو اپنے ہاتھ سے مار دیں گی' خاندان میں نہیں بیاہیں گی۔اماں خدا مجھے معاف کرے جھوٹی بہت تھی۔نہ آپا کو مارا' نہ اکسایا اور بیاہ دیا پھوپھا کے گھر۔

پھوپھا ان دنوں بہت میٹھے تھے دادی کے ساتھ۔دادی نے ہی ابا سے رشتہ لے کر دیا پھوپھا کو۔رشتہ کیا بیاہ بھی دیا اور پھر آئے پھوپھا کی جوتی کی نوک تلے ابا.....

''احسان مانے میرا سوور کی اولاد کو کھلاتا ہوں (ابا نے بھی تو کھلایا تھا)۔'' پھوپھا خاندان میں دہاڑتے پھرتے۔

شادی کے شروع میں تو دو ایک بار آپا آئی کہ اس جہاں کی بابت بیان کر سکے جہاں ''دھتکار'' راج کرتی ہے اور ''بے بسی'' رعایا بنتی ہے۔تاکہ ابا کی راتوں کی نیند اڑا سکے۔بھولی آپا۔بے چاری نے دس بھی پاس نہیں کی تھیں کہ ابا نے شادی کر دی۔دادی نے پھوپھی کی راہ کھولنے کے لیے دونوں کی راہ ہی کھوٹی کر دی۔پھوپھی' دادی' ابا' سب آپا کو لے ڈوبے۔

سنا تھا پھوپھا جو کہ ابا کے ہی گاوں کے رہنے والے تھے جوانی کے دنوں سے ہی ابا سے بیر لیے ہوئے ہیں۔نہ جانے کس کبڈی کے دنگل میں ہرا دیا تھا ابا نے کہ پھوپھی کا رشتہ لے کر ہی پھوپھا نے ہار کا بدلہ لیا۔ویسے عورت وہ ترپ کا پتا ہے جو ہر مرد جواری کو راس ہے۔پھوپھا کو بھی پھوپھی خوب راس آئیں کہ پھوپھی کی روز صبح و شام جوتیوں سے تواضع ہوتی تھی۔سات آٹھ سال تک تو وہ نام کی ہی دلہن رہی۔لوگ تھوتھو کرتے۔پھوپھی کو تو خاندان کی عورتیں کھسری کہتی رہیں۔ویسے ٹھیک ہی کہتی تھیں پھوپھی بھی اماں جیسی ہی تو تھی۔

☆ ☆ ☆

عقیل ایک بار فیل ہوا تو لے جا کر ابا نے ویلڈنگ کی دوکان پر بٹھا دیا۔ایک بار پھر اماں نے اپنے ماں باپ کی گالیاں سنیں اور

چھٹے بچے سے بڑھا ہوا پیٹ.....اف توبہ اماں کیسے چیخی تھی.....

اگلی کئی راتوں تک میں خواب میں ڈرتی رہی۔اماں خون میں لت پت ہوگئی۔یہ رکھ رکھ کر ابا نے لاتیں ماریں۔ساتھ والی پڑوسن خالہ ابا کو پرے دھکیل کر دو تین اور ہمسایوں کے ساتھ اندر آئی پر دیر ہو چکی تھی۔بھلا اماں کو کیا ضرورت تھی اتنی لمبی زبان چلانے کی۔ابا نے کہا بھی۔

''دفعان ہو جا.....میرا سر نہ کھا''

اور یہ بار بار یہی کہتی رہی۔''شام کو دوکان پر چلا جائے کرے گا۔دن میں اسکول جانے دو۔''

ابا نے سالن کی پلیٹ منہ پر دے ماری۔برداشت کی بھی حد ہوتی ہے۔کمینی عورت کھانے کے دوران بولے جا رہی تھی۔مار کھائے جا رہی تھی۔بکواس کیے جا رہی تھی۔

''دن میں سکول چلا جائے گا۔شام میں دوکان۔''

میرے کان پک گئے تو کیا ابا کے نہیں پکے ہوں گے۔اب سکون رہا جب چھٹا بچہ پیٹ میں ہی مرحوم ہو گیا۔تھو ہے ایسی عورتوں پر جی.....سو بار تھو ہے.....جب ہمت نہیں ہے تو ایسے شیروں کے منہ کیوں لگتی ہو.....چپکی کیوں نہیں پڑی رہتی.....مار نہیں سکتی تو پھر مر کیوں نہیں جاتی.....

عقیل ویلڈنگ کرنے لگا۔بڑا خوش رہتا کہتا استاد بڑا پیار کرتا ہے۔رات گئے تک گھر نہ آتا۔شکیل نے رات دن کتابیں چاٹنا شروع کر دیں۔اور میں تو بمشکل ہی پاس ہوتی تھی۔اماں اسکول میں استانیوں کے آگے ہاتھ جوڑتی کہ سالانہ میں کیسے بھی کر کے اسے پاس کر دو۔عجیب اماں تھی.....سمجھتی ہی نہیں تھی.....جس دن حساب کا پرچہ تھا اس رات ابا نے اماں کی چٹیا پکڑ کر وہ گھمائی وہ گھمائی کہ ساری رقمیں صفر رہ گئیں۔

اماں سے ابا کی خاندانی گرم شال جل گئی تھی۔استری کی شکل شال پر چھپ گئی تھی۔میں نے اس رات قسم دادا مرحوم کی دادی کو ایسی کیفیت میں دیکھا جیسے ان پر ''اماں کی دھلائی'' نے وجد طاری کر دیا ہو۔وہ سرور سے ہلکورے لینے لگی۔ایک وجد مجھ پر بھی طاری ہوا اور میں حساب کے پرچے میں فیل ہوگئی۔اماں کے دو ہاتھ ایک گردن کو چھڑاتے نظر آتے۔نہ ضرب ہوتے کہ دو سے چار ہو جاتے۔نہ تفریق کہ دونوں ہی نہ رہتے۔جواب کوئی تو آتا.....حاصل صفر ہی سہی.....جواب کوئی تو ہوتا.....وصول صفر ہی.....

استانی جی نے بلا کر مجھے پرچہ دکھایا۔پورے تیرہ نمبر لیے تھے میں نے۔جمیلہ کچھ اپنی اماں کا ہی خیال کر کے پڑھ لیا کرو۔''

اب انہیں کیا بتاتی ان ہی کا خیال کر کے تو نہیں پڑھا۔ساتھ کے بستر پر پڑی اپنے پھٹے ہونٹوں کا خون صاف کرتی رہی اور اپنے کالے بھدے ہاتھوں سے گردن کو سہلاتی رہی۔کیسی عورت تھی بات مانتی ہی نہیں تھی کہ عورت ہی بن کر رہے انسان نہ بنے۔غلطی تو انسانوں سے ہوتی ہے یہ گنجائش انہیں حاصل نہیں تھی۔ملتی بھی کیسے انہیں یہ گنجائش نکلوانی آتی ہی نہیں تھی۔پھر مرو.....کھاو مار.....کبھی بکری اور شیر بھی ایک گھاٹ سے پانی پیتے ہیں؟ اگر پیتے ہیں تو وہ میاں بیوی ہوتے ہیں.....روز حملہ.....روز شکار.....ہاں پھر یہی

ہوتا ہے.....لیکن صرف بکری کے ساتھ.....

☆ ☆ ☆

ہمارے گھر میں نانا نانی کا نام لینا ایسا ہی ناپاک تھا جیسے خنزیر کا نام لینا۔ دادی اپنے ہر خطبے میں فرماتی کہ ''اس کے باپ نے کسی رنڈی کے پیچھے لگ کر خودکشی کر لی تھی۔ ماں بھی کیوں پیچھے رہتی وہ بھی چھت سے لٹک گئی۔ حرام موت مرے۔ حرامیوں کی اولاد ہے تمہاری ماں۔''

دادی اپنے حلال بیٹے کی حرامی ماں کے بطن سے جنمی اولاد سے مخاطب ہوتے ہوئے عالمانہ روپ اختیار کر لیتی۔

''تمہارے نانا کا آنا جانا تھا وہاں ہیرا منڈی.....توبہ مجھے تو رات کی نماز بھی پڑھنی ہے۔ خیر وہ ایسا رجھا ایسا رجھا اس رنڈی کم ذات پر کہ جان سے گیا..... یہ رنڈیاں بھی کسی کی بنتی ہیں بھلا.....اس نے الٹی جوتی کا تلوا دکھایا اور دلتی مار دُرفٹ کیا.....لٹک گیا چھت سے اس کے عشق میں.....درفٹ.....اٹھ کر وضو کروں.....''

رنڈی رنڈی کہتے دادی ایسی کلمہ گو بن جاتی جو ''حق بات'' کہنے سے بالکل نہیں جھجکتی۔ نانا نانی تو تھے نہیں ہمارے لیکن ابا اور دادی کے حج پر جانے کے بعد جب کبھی ہم وہاں گئے۔ کسی کو بڑے نانا کہتے کسی کو بڑی نانی۔ وہاں کافی کھیپ تھی چھوٹے' بڑے' منجھلے' نانوں اور نانیوں کی۔

''اللہ بخشے بہت نیک تھے تمہارے نانا.....تہجد گزار۔ ہر ایک کی مدد کے لیے تیار۔'' کوئی دُور پار کی نانی بتاتی۔

لو بھلا ہمیں کیا ان باتوں سے۔ ہم کھیلنے کودنے لگے لیکن عقیل بیٹھا سنتا رہا۔ بڑی اونچی چیز تھا عقیل۔

''وہ لڑکی بھاگ کر نانا کے پاس آ گئی کہ میاں جی بچا لیں مجھے۔ نانا نے گھر رکھ لیا۔ خاندان والوں نے تہجد گزار میاں جی کو رنڈی باز بن دیا۔ جب سب نے انہیں رنڈی باز ہی سمجھ لیا تو چھت سے لٹک گئے۔ انہیں چھت سے لٹکا دیکھ کر پہلے تو وہ ہیرا منڈی والی ننگے سر گھر سے بھاگی۔ پھر یہی کام نانی نے کیا۔ خاندان والے نانی کو تو پکڑ دھکڑ کر میت کے پاس لے آئے۔ ان کی چوڑیاں توڑیں اور سونے کی اتروا لیں۔ سر پر سفید دوپٹا دیا۔ بیوہ بیوگی میں ہی رہے انہوں نے سارے زرق برق کپڑے فوراً ٹرنکوں میں سے نکال لیے۔ جیسے مرحوم کی بیوہ میت کے اٹھتے ہی پہلے انہیں ہی تو نکال کر پہنے گی۔ خیر ویسے جب نانی میاں جی کے کپڑے کتر کتر کھانے لگیں' اور ان کی جوتیاں چاٹنے لگیں تو وہ ''مکمل بیوہ'' کہلائیں۔

عقیل نے جان توڑ کوشش کر کے سنا سنایا مضمون ہم تک پہنچا دیا۔

نانی کو ایسے بیوہ بنا دینے والے نہ جانے کس نسل سے تھے۔ کہاں سے لٹے پٹے آئے تھے۔ یہاں آ کر پڑاؤ کیوں کیا۔ دادی کہتی ''یہ سکھ تھے۔ پھر کبھی کہتی نچلی ذات کے دلت تھے۔ یہاں آئے تو مسلمانی اوڑھ لی کہ جی مسلمان ملک میں مسلمان بن کر رہیں گے تو مزے ہی مزے ہوں گے۔ تمہاری پرنانیاں نہ جانے کہاں کہاں منہ کالا کرتی پھرتی تھیں۔ دُرفٹ اور مرد۔ مردودوں نے کوئی سکھنی' ہندنی چھوڑی نہیں تھی۔ چوڑوں چماڑوں میں گھسے رہتے تھے۔ وہ جو سنتالیس میں عورتوں کی عزتیں لوٹی گئیں یہی تو تھے پیش پیش۔ (دادی

دور بین لگائے دیکھ رہی تھی)۔نہ جانے کہاں کہاں منہ مار کر اِسے اُسے اٹھا کر بنا کر لے آئے خاندان ۔ پاک سرزمین میں قربانیاں دیں ہمارے بڑوں نے اور آ بسے یہ دلت' کم ذات' رنڈی باز۔''

دادی کو اپنے پاکستان میں پیدا ہونے پر بہت فخر تھا۔ان کے لیے سب مہاجر حرامی تھے ۔اسی لیے دادی انہیں ''رلا'' کہتی ۔کوئی یہاں سے رلا کوئی وہاں سے رلا اور درفٹ آ گئے بن ٹھن کے قبضہ کرنے ۔اسی رلے میں دادی اپنے سینتس سالہ بیٹے کا رشتہ لے کر گئی تھی ۔بقول چھوٹی بڑی کسی نانی کے جوتیاں گھس گئی تھیں بہت سوں کی میاں جی کی اکلوتی بیٹی کا رشتہ لینے کے لیے۔

آپا نے ایک بار اماں سے پوچھا۔''کیا دیکھ کر نانا نے آپ کی شادی کر دی تھی ابا سے۔؟''

اماں ہنسنے لگی۔ہنسی بھی تو کب۔

''شرافت !تمہارے نانا کہا کرتے تھے بھوکا نہیں مارے گا تمہیں۔بہت محنتی ہے۔''

کیا کمال کے حوالدار تھے نانا۔ابا کی آنکھ کی شرافت تو پڑھ لی۔اس شرافت کی نزاکت نہیں پڑھی۔ویسے اچھے محنتی تھے ابا کہ دنیا کی کوئی ایسی گندی گالی نہ تھی جو کما کر اماں کے کان میں نہ ڈالی ہو۔اور دنیا کی کوئی ایسی بدکردار عورت نہ تھی جس سے اماں کو تشبیہ نہ دی ہو۔ابا نے اماں کو بھوکا مارا نہ بھرے پیٹ سے زندہ رکھا۔کمال کی بات ہوئی نا۔اور ہاں کوٹھے باز نہیں تھے ابا۔شریف اتنے کہ محلے کی کسی عورت نے انہیں کبھی سر اور نظر اٹھا کر دیکھتے نہیں دیکھا تھا۔وہاں موذن اذان دیتا اور یہاں ابا مسجد کی طرف نکل جاتے ۔دو حج اور تین عمرے کیے تھے۔ایسے نیک اور مومن صفت تھے ابا۔

گھر میں بکرے کا گوشت پکواتے ۔مہینے میں دو درجن دیسی مرغیاں لے کر آتے ۔صبح حلال کر جاتے اور شام آتے ہی یخنی پیتے ۔ اسی لیے تو دادی کہتی تھی۔

''ہم تو ایسے ہی شاہی کھانا کھاتے ہیں۔بھوکے ننگے تھوڑی تھے ہمارے دادے پردادے۔یہ بیسن کی ٹکیاں' آلو کے ملیدے' پتلی دالیں ہم نہیں کھاتے ۔پیلے چاول اور دھنیہ پودینے کی چٹنی۔درفٹ ہمیں کیا پتا سنتالیس کے کیمپوں میں کیا کیا دیا جاتا تھا۔''

☆ ☆ ☆

اماں چھت پر سردیوں کی دھوپ میں بیٹھی دونوں ہاتھ (وہی ہاتھ) لہرا لہرا کر نہ جانے کس سے باتیں کر رہی تھی۔وہ خدا کو سنا رہی تھی' بتا رہی تھی' یا پوچھ رہی تھی یا اپنے اماں باوا کو کٹہرے میں کھڑا کیے اپنے پیدا کیے جانے کی وجہ پوچھ رہی تھی۔پہلے میری سمجھ میں نہیں آیا پھر میں نے ذرا غور کیا تو جانا کہ وہ بڑبڑا رہی تھی اور ہاتھ (اللہ مارے ہاتھ) ایسے لہرا رہی تھی جیسے دہائیاں دے رہی ہوں۔پھر.....پھر.....گو مجھ میں سکت نہیں اس منظر کو دوبارہ دہرانے کی لیکن کوئی اگر مجھے تھام لے.....میری کپکپاہٹ روک دے تو شاید.....ہاں تو انہوں نے اپنے ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیے۔اور اتنی زور سے ایسی عجیب چیخ ماری کہ میں مارے ڈر کے نیچے بھاگ گئی۔کچھ دیر میں میں عقیل' شکیل کو بھی اوپر لے گئی۔ہم تینوں کے مجمع نے اماں کو' بڑبڑاتے' بال نوچتے' دہائیاں دیتے' اور آنکھوں سے خون رستے.....میں قسم کھا سکتی ہوں وہ خون ہی تھا.....دیکھا۔''

نیچے سے دادی کے چلانے کی آواز آئی تو ہم نیچے بھاگے۔اماں نیچے آ کر ایسے کپڑے دھونے لگی جیسے اوپر کچھ ہوا ہی نہیں۔ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا کہ دیکھو اماں کیسے ناٹک کرتی ہے۔دادی ٹھیک کہتی ہے

''نٹنی ہے۔لے جا کر کسی چور ہے میں کھڑا کر دو ایسا ناٹک کر کر کے دکھائے گی کہ دنیا گھروں کو جانا بھول جائے گی۔مرد تو ساتھ لے جا کر ہی ٹلیں گے۔''

چند دن پہلے آپا آئی تھی تو اماں بلک بلک کر روتی رہی تھی۔بیٹی کے جسم کا کوئی ایسا حصہ نہیں تھا جو نیلا پیلا نہیں تھا۔ابا آئے ابا کو بتایا کہ ایسے جانوروں کی طرح مارتے ہیں۔ابا کھانا کھاتے سنتے رہے اور پھر سو گئے۔کیا کرتے بے چارے ابا۔چند دنوں بعد تایا کے بیٹے کے ساتھ آپا کو گاڑی میں بٹھا دیا۔

''جاو جی اپنے جھگڑے خود سمیٹو۔''

جھگڑا سمٹ گیا۔اماں چند دنوں بعد ہی چل بسی۔کان اور ناک سے خون نکلنے لگا تھا۔کوئی کہتا دماغ کی نس پھٹ گئی۔کوئی کہتا تینوں اٹیک اکھٹے ہوئے۔دل بند۔اماں ختم۔

جو بھی ہوا اماں مر گئی۔تین چار دن ہم سب خوب روئے۔پھر سب ٹھیک ہو گئے۔پڑوسن خالہ البتہ بہت ہفتوں تک روتی رہیں۔بیمار بھی ہو گئی تھیں۔انہیں بہت غم لگا تھا اماں کے جانے کا۔جبکہ عقیل نے کہا۔

''یہ ہوئی نا بات۔روز کے جنگ و جدل سے جان چھوٹی۔''

مہینہ بہت سکون سے گزرا۔نہ کوئی لڑائی نہ جھگڑا نہ ماں کی نہ باپ کی۔اتنا سکون تھا گھر میں یقین نہیں آتا تھا کہ یہ ہمارا ہی گھر ہے۔اماں پہلے ہی مر جاتی بھلا۔ایسے سکون کے لیے کیا مائیں اپنی جان نہیں دے سکتیں۔ایک دن ساتھ والی خالہ مجھے چپکے سے ساتھ لے گئیں۔نہ جانے کیا کیا کہتی رہیں مجھے تو سب بکواس لگا۔کہنے لگیں

سب کا کہنا ہے کہ تمہارے ابا نے اماں کو زہر دے کر مارا ہے۔

میں کیسے مان لیتی.....بھولی خالہ.....زہر دے کر مارنے والوں میں سے نہیں تھے ابا.....زندہ لاشیں بنا کر گھر کی قبر میں رکھنے کے حق میں تھے۔خالہ کے ابا تھوڑی تھے جو خالہ کو پتا ہوتا۔اماں نے زہر کھا لیا ہو تو ہو۔

میں گھر واپس آئی تو ایک ایک برتن سونگھنے لگی۔عقیل شکیل کو بتایا وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسیں اور کہنے لگے۔

''اتنی ہمت والی ہوتی اماں تو ابا یا دادی کو زہر نہ کھلا دیتیں۔''

کہہ دنوں ٹھیک رہے تھے۔چلو ابا یا دادی کو نہ دیتی ہم چاروں بہن بھائیوں کو ہی دے دیتی۔ورنہ آپا کو تو ضرور ہی دے دیتی۔اسی لیے تو اماں مجھے کبھی پسند نہیں رہی۔اور میں نے اس کے مرنے کا سوگ نہیں کیا۔سکول میں لڑکیاں حیران ہوتیں کہ جمعہ جمعہ چار دن نہیں ہوئے جمیلہ کی ماں کو مرے اور اس کی کھلکھلاہٹیں تو دیکھو۔ایک لڑکی اماں کا افسوس کرنے لگی تو میں ہنسنے لگی۔اس نے مجھے خوب کھری کھری سنائیں۔بے شرم' بے غیرت کہا۔نادان لڑکیاں.....سب کی سب.....وہ کیا جانیں بے چاریاں' ماں کی لاڈلیاں' باپ کی دلاریاں کہ اماں

کا مرنا کتنی خوشی کی بات تھی.....کتنا سکون تھا اب مجھے.....کتنا سکون ہوگا اماں کو بھی۔

☆ ☆ ☆

''بچی تیری ماں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ جمیلہ سے کہنا کہ پڑھائی نہ چھوڑے موت کا کیا پتا کب آ جائے۔ جمیلہ پڑھ کر کوئی نوکری کر لے اور جانوروں کے اس باڑے سے نکل جائے۔'' خالہ مجھے بیٹھائے سمجھا رہی تھیں۔

میں جو ہر پرچے میں بارہ تیرہ نمبر لے کر بھی اگلی جماعت میں بھیج دی جاتی تھی۔ اماں کی جانوروں کے باڑے والی بات سمجھ گئی۔ اس بار اچھے نمبروں سے پاس ہوئی۔ کیسے نہ پاس ہوتی میرے پرچوں سے چند دن پہلے ہی دادی نے ابا کو سکھا دیا کہ بس بہت ہو گیا اسکول۔ گھر کے کاموں میں لگے اب یہ۔

ابا نے میری طرف منہ کر کے گھورا اور کہا ''گھر بیٹھ جمیلہ۔''

میں نے بستہ لیا اور شکیل جو گھنٹی پر گھنٹی بجا رہا تھا کی سائیکل پر جا کر بیٹھ گئی۔ ابا نے وہیں میری چٹیا پکڑی اور دے کر زمین پر پٹخا۔ میں بھی پٹخے کھاتی رہی لیکن سکول ضرور آئی۔ مجھے مار پڑتا دیکھ کر شکیل تو سائیکل بھگا کر دکان پر چلتا بنا تھا۔ وہ تھا ہی اماں کی طرح بزدل۔ انہی کی طرح رُل رُل کر مرے گا انشاء اللہ۔ میں پیدل سکول گئی۔ واپس گھر آئی تو سیدھی کچن میں گھس گئی۔ روٹی پکانے کا دادی کا وزنی لوہے کا چمٹا آگ پر رکھ دیا۔ اور لے جا کر دادی کی آدھ کٹی ٹانگ پر رکھ دیا۔ دادی نے ایسی چیخ ماری جیسی اماں نے بچے کے پیٹ میں ہی مر جانے پر ماریں تھیں۔

''عقیل کے پاس ویلڈنگ مشین ہے گردن کے آر پار کر دے گا۔ شکیل نیلا تھوتھا اپنے بکس میں چھپا کر رکھتا ہے۔ کسی دن چپکے سے کھلا دوں گی۔ نیلی ہو کر بھی نہیں مرے گی۔ اگر ابا نے آج مجھے مار بھی دیا تو عقیل اور شکیل تو ہیں۔''

اللہ بخشے مجھے جب کبھی میں مر جاوں۔ دادی اپنی تکلیف بھول بھال مجھے گھورتی رہی۔ نیلے تھوتے سے ڈرتی دادی تایا کے گھر جا ٹکی اور جلد ہی قبر میں۔

لو جی یہ ہوئی نا بات۔ میرے پاس جو جمع جتھا تھا میں نے اس کی جلیبیاں منگوائیں۔ اور جنازہ اٹھنے سے پہلے بچوں میں تقسیم کروا دیں۔ اماں کہا کرتی تھی۔

''تمہاری دادی قوم نوح سے ہے۔ سات نسلیں مار کر مرے گی۔'' سات کا تو پتا نہیں لیکن اماں کی نسل ضرور مار کر مرنے والی تھی دادی۔ پھوپھی نے کہا ''اماں کے لوٹے سے سب نہانا۔ خدا سب کو ایسی صحت اور عمر دے۔''

میرے کان میں جیسے ہی بھنک پڑی میں نے ڈھونڈ ڈھانڈ لوٹا چھپا دیا۔ دو دن کافی ڈھونڈ پڑی لوٹے کی۔ پر لوٹا مل کر نہیں دیا۔ ابا تو وہ بین کر کر کے روے کہ ہم اپنی اماں کے مرنے پر نہ روے ہوں گے۔ آپا کو میں نے میت کے پاس دانت کچکچاتے دیکھا۔ شاید ان کی بھی حسرت تھی دادی کی گردن نوچ کھانے کی۔ ویسے دادی کی ہم عمر بوڑھیوں نے دادی کو نیک ترین بنا کر کفنایا۔ وہی دادی کے چہرے پر ڈھونڈ کر نور لائیں۔ دیکھا ہم سب زندگی ہی نہیں موت کے ساتھ بھی منافق ہوتے ہیں۔ اچھا ہی ہو جو روح کا فرشتہ روح لے جاتے ہوئے

ایک ڈھپہ بھی پیشانی پر لگا جائے..... ''نیک بخت''..... ''بد بخت''۔

دادی کے مرنے سے آزادی سی آزادی تھی۔ میں نے اسکول میں سب کو ڈانس کر کے دکھایا۔ ابا دوسری شادی کرنے کے لیے ایسے تیار ہو گئے جیسے ان کی شادی تو طے تھی بس اماں کی موت ٹل رہی تھی۔ میری بات تایا کے گھر پکی کر دی۔

خالہ نے خوب اکسایا کہ اپنے نانکے گھر کو بھاگ جاو جمیلہ۔ لیکن ماں جئی تھی تو کیسے بھاگ جاتی۔ اتنی ہمت نہیں تھی۔ عقیل جہادی گروپ کے ساتھ نکل گیا تھا۔ جانے سے ایک دن پہلے اس نے ابا کی گردن دبوچ لی تھی۔ جب ابا مجھے اماں کی طرح مار رہے تھے۔ عقیل نے گھونسے مارے' گردن دبوچی اور جہادی گروپ کے ساتھ کشمیر بھاگ گیا..... بھگوڑا..... کشمیر کبھی آزاد نہیں ہوگا..... تو اونچی پہاڑی سے گر کر مر جائے گا۔ شہید نہیں ہوگا..... تیری لاش کھائیوں میں سڑتی رہے گی' مٹی نہیں بنے گی..... تجھ گند کو فرشتے کبھی نہیں اٹھائیں گے۔ نہ حساب کے نام پر نہ سزا اور سوال کے نام پر۔ جو گھر کا جہاد چھوڑ کر باہر بھاگے وہ بے شہید ہو کر مرے۔'' میں نے اس بد دعا دی۔

شکیل اللہ مارا عورتوں سے بھی پرے تھا۔ میرے کان میں گھسا کہتا رہا کہ ''چپ چاپ تایا کے گھر شادی کر و لے۔ ورنہ ابا ہم دونوں کو مار دے گا۔''

تو بہ کتنی پیاری تھی شکیل کو اپنی جان..... اور مجھے بھی.....

میرے سر کی کھال نظر آنے لگی تھی۔ رنگ کولتار اور ہاتھ بھدے لعنتی ہوتے جا رہے تھے۔ میں شیشہ دیکھتی تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔ میں تیزی سے ''اماں'' بنتی جا رہی تھی۔ مجھے نفرت تھی ماں جئی بننے سے۔ نفرت سے زیادہ خوف..... خوف سے زیادہ اور خوف.....

آپا مرتے دم تک ہم سے مل نہیں سکتی تھی۔ شکیل زنانہ ابا کی گردن دبوچنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ خبردار جو کسی نے والدین کی عزت و احترام کی بات کی ہو تو۔ مجھے جنت کا لالچ دینا نہ دوزخ سے ڈرانا۔ ہاں..... بس.....

میری استانی نے میرا سر کھا لیا تھا کہ ''جمیلہ باپ ہے وہ تمہارا۔ قربان ہو جاو اس کی رضا پر۔ صبر کرو! خدا اجر دے گا۔''

مجھے تو کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ ''صبر کروں اور اجر کا انتظار کروں یا جبر کروں اور صبر سمیٹ لوں۔''

☆ ☆ ☆

میری ہونے والی سوتیلی ماں ابا کے خاندان کی دور پار کی دو بار کی بیوہ تھی۔ ہر دوسرے دن آ جاتی۔ شکیل کہتا۔ ''پھلجڑی'' ہے۔ رونق رہے گی گھر میں۔ ایسی عورتوں کو تو وزارتیں سنبھالنی چاہیے۔ لیکن ہمیں کیا محلے سنبھالے یا وزارتیں۔ ابا کو ایسی ہی عورت ملنی چاہیے جو اگر ایک جوتی کھائے گی تو دس خود بھی مارے گی اور دوسرے مردوں سے پڑوائے گی بھی۔''

ایک رات ایسے ہی میری آنکھ کھل گئی..... تو بہ ایسے ہی تھوڑی کھلی تھی۔ وہ بھینسا میرے بستر پر بیٹھا میرے منہ پر سے رضائی ہٹا رہا تھا اور..... اور..... میں نے وہ چیخ ماری کہ ڈر گیا۔ بھاگ کر دور جا کھڑا ہوا۔ اور کمرے سے نکل گیا۔ منحوس مارا شکیل چیخ سن کر بھی دبکا رہا۔ پورا اماں پر گیا تھا۔ اس کا تو اپنا بستر گیلا ہو گیا۔ ہمت کر کے کمرے سے باہر جھانکا تو تایا تائی اور وہ بھینسا سر جوڑے بیٹھے نظر آئے۔

اماں کہا کرتی ''میری شادی میں یہ لمبا تڑنگا تھا۔'' اس لمبے تڑنگے کی اُس شادی میں میں بھاگی پھرتی تھی جس کی دلہن کو بعد میں مرگی کے دورے پڑنے لگے تھے۔ یہ کہتے رہے دلہن مرگی کی مریض ہے۔ دلہن والے کہتے رہے ''مرگی زدہ کر دیا معصوم کو''۔ جس نے جو بھی کہا بہر حال لڑکی کسی ایک دورے کا اثر لے گئی اور چل بسی۔ دوسری نے طلاق لے کر جان بچائی۔

صبح ابا کے کمرے سے مٹھائی کا ڈبہ ملا۔ یعنی تکبیر پڑھی جانے والی تھی۔ شام کو پڑوسن خالہ بھاگی آئیں۔

''تمہارے ابا نے مجھے جہیز کے رضائی گدوں کے لیے پیسے دیئے ہیں۔ بھاگ جاو جمیلہ..... بھاگ جاو.....'' وہ بے چاری رونے لگی اور میں بھی۔

''آو میں تمہیں تمہارے نانا نانی کے چھوڑ دوں۔ اسی جمعہ تمہارا نکاح ہے۔''

میں اور رونے لگی۔ کیا کروں کہاں جاوں۔ کم بخت میری ہی کمی تھی دنیا میں آنے کی۔ میں خلیفہ تھی یا سلطان جس کا دنیا میں آنا بہت ضروری تھا۔ کس قوم کی کمان سنبھالنے تھی میں نے جو مجھے عرش سے فرش پر اتارا گیا۔

خالہ نے شکیل کو بلوایا اسے سمجھایا۔ دُرفٹ وہ تو الٹا خالہ پر چڑھ دوڑا۔

خالہ آپ کیوں اسے الٹی پٹیاں پڑھا رہی ہو؟

خالہ بے چارگی سے مجھے دیکھتی رہی۔ رات کو شکیل سو گیا تو میں نے زیور نکالے لیکن پھر ان پر تھوک کر واپس رکھ دیا۔

☆ ☆ ☆

میرے نانا نانی کا گھر داتا دربار کے پیچھے گھوڑا ہسپتال کے آس پاس کہیں تھا۔ چند ایک بار بہت چھوٹے ہوتے تو حویلی دیکھی تھی۔ اور اماں بھی بتایا کرتی تھی کہ بہت شاندار حویلی ہے تمہارے نانا کی۔ ویسے مجھے اماں کی باتوں پر ایسا کوئی یقین نہیں تھا۔ وہ تو یہ بھی کہا کرتی تھی کہ میرے نانا گبرو جوان تھے۔ ذرا سا گھور کر دیکھتے تو پیشاپ نکلوا دیتے۔ لو جی ایسے گبرو جوان کی ایسی ٹڈی دل بیٹی جو ہر روز مسلی جاتی۔ جس کے بچوں کے ڈر کے مارے ہر روز پیشاپ نکلتے۔

ہم حویلی آ گئے۔ لیکن کہاں کی حویلی اور کہاں کی شان۔ میں نے کہا نا اماں کو عادت تھی جھوٹ بولنے کی۔ وہ حویلی تھی یا کٹڑی یا انسانوں سے بھری' گلی سڑی' بدبودار' ڈربوں سے اٹی ''بستی''۔ جو ابھی تک کسی عذاب سے تباہ نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ شاید اس بستی کو ''عذاب'' کا مستحق بھی نہیں سمجھا گیا تھا۔ مجھے تو ایسی ہی پھٹکاری ہوئی ''بستی'' ہی لگی وہ۔

پھر یوں ہوا کہ خالہ تو خود پریشان ہو گئی وہاں آ کر۔

''تمہاری اماں کے ساتھ ایک بار آئی تھی۔ لیکن تب تو اچھی خاصی حویلی تھی۔''

ہمیں سمجھ نہیں آئی کہ کہاں جائیں۔ کس کے کمرے سے' کس گلی سے' کس سیڑھی سے' کس چوبارے کو پار کر کے۔ کسی کے چھجے کو پھلانگ کر کس طرف کو نکلیں۔ خیر ہوان دو بڈھیوں کا انہوں نے ماں جئی کو پہچان لیا۔ خالہ نے وقت ضائع کیے بغیر سب کچھ کہہ دیا۔ اور وہ تو جیسے پھونپو بج اٹھا اس حویلی نما بستی میں۔

کونے کھدروں، سرنگوں، ڈربوں، چوباروں، چھجوں سے وہ لمبے، چوڑے، پتلے، بوڑھے، لاغر، جوان، مرد، عورتیں، لڑکے، لڑکیاں، بچے، گود کے، پیٹ کے، ایسے نکلے جیسے بگل بجا ہو کہ آؤ آؤ.....نک چڑھی بنداری کا تماشا دیکھ لو۔

اے یہ بھاگ آئی کیا؟

اس بڈھی کو کانوں کا مسلہ نہیں تھا اسے چسکے کا مسلہ تھا۔دس بار اس کے کانوں میں گھس کر بتایا گیا تھا کہ کیا چل رہا ہے۔پر وہ ہر دو منٹ بعد مجھ پر نظر ٹکا کر چلانے لگتی۔

اے یہ بھاگ آئی کیا؟ (دُرفٹ میرا)

اس کا باپ تو ہمیں مار ہی دے گا.....(کم بخت ماری میں)

اے منے بھاگ کر جائیو پھاٹک کا کنڈا کس دیو.....(مرن جوگی)

وہ گاہے بگاہے چلاتی رہی۔اس کی پھٹی ہوئی آواز دادی کی آواز سے مشابہ تھی۔ایک بڈھے نے آگے بڑھ کر بڈھی کے دونوں شانے ہاتھوں میں دبوچ کر اس زور سے جھنجھوڑا کہ بڈھی مروندے کی طرح چرمرا گئی۔شاید یہ اس کے لیے خاص گھنٹی تھی جس کے بجتے ہی خیر سے بڑی بی رات تک سہمی بیٹھی رہی۔لیکن باقی حویلی والوں کو ایک فلم مل گئی۔دیکھنے، سننے، ہنسنے کے لیے۔ساتھ ساتھ نمکو، چپس اور پان بھی چلتے رہے۔دادی ٹھیک کہتی تھی۔ہم نٹنی کی اولادیں ناٹک کرنا خوب جانتے ہیں۔

''میرا بھی ناٹک جاری تھا.....ہاوس فل شو رہا.....''

خالہ پریشان سی پریشان ہوئیں کہ پلو سے گیلی آنکھیں صاف کرنے لگیں۔وہ تو مجھے ان کے حوالے کرنے آئی تھی۔ان کا اپنا دم ابا کا نام سن کر نکلا جا رہا ہے۔اس لحاظ سے اماں کا دم تو بہت دیر بعد نکلا۔ہاں شاید تھوڑی سی بہادر تھی اماں۔جان کو کافی دیر تک جان سے لگائے رکھا۔

☆ ☆ ☆

''دو بول پڑھوا دو ابھی کے ابھی پھر کیا کرلے گا وہ۔''

یہ آواز کسی عورت کے منہ سے نکلی تھی۔ظاہر ہے عورتیں ہی ایسی بزدلانہ باتیں کرتی ہیں۔پھر خیر سے سب کے منہ سے یہی آواز نکلی۔

''چلو بھئی بچوں جاو یہاں سے۔''

کسی نے کہا۔اب خیال آیا تھا انہیں پرے کرنے کا۔مجھے بھی اندر کہیں بھیج دیا۔جہاں چھوٹا بڑا ہر وہ جو بڑوں کی پنچائیت سے پرے تھا وہ پنچائیت لگا کر بیٹھا تھا۔

چند گھنٹے ہی گزرے ہوں گے کہ مولوی صاحب آ گئے۔میں نے اپنی گندی سی اردو کی لکھائی میں اپنا نام ''بنتِ دینا'' لکھ دیا۔کسی نے پڑھنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ بچی نے لکھا کیا ہے۔خالہ نے اچھی خانہ پری کروائی تھی۔دو ہزار جیب خرچ۔دو لاکھ حق مہر اور طلاق کا حق

میری طرف۔لڑکا اماں کے چھوٹے چچا کے منجھلے بیٹے کا بیٹا تھا۔خالہ مجھے سمجھا گئیں کہ نکاح ابا کی وجہ سے ضروری تھا۔میں خوب دل لگا کر پڑھوں۔رخصتی وہ دھوم دھام سے اپنے گھر سے کریں گی۔

میں اس رات ڈٹ کر سوئی۔شام ہوتے ہی ابا' تایا اور وہ بھینسا آئے ایک دو غنڈے ٹائپ آدمی لے کر۔ابا کو صرف شک تھا وہاں میرے ہونے کا۔انہوں نے جب میرا پوچھا تو سسر جی نے نکاح نامہ آگے کر دیا۔ابا تو آپے سے باہر ہو کر ماں کی گالیاں دینے لگے۔تایا نے تو فورا کہہ دیا کہ ہم ایسی کنجری صفت لڑکی کو نہیں جانتے۔گھنٹوں میں نکاح پڑھوا کر بیٹھ گئی۔نہ جانے کس کا گند تھا جو میرے بھائی کے سر تھوپا۔ایسی کنجریاں' رنڈیاں ہمارے خون کی پیداوار نہیں۔خوب بھڑک کر گئے۔ساری نانیوں' پرنانیوں' نانوں' پرنانوں کو گالیاں نکال کر گئے۔

شکیل بھی آیا زنانہ بک جھک کر چلا گیا۔خس کم جہاں پاک۔

میرے سسر مجھے اسکول چھوڑ دیتے۔لے بھی آتے۔صبح مجھے ایک نان اور چائے کا پیالہ مل جاتا ناشتے میں۔پھر رسک اور چائے۔پھر صرف چائے۔پھر وہ بھی گئی۔جسے زیادہ بھوک لگتی وہ دربار چلا جاتا لنگر کھا آتا۔جہاں ساری بستی والے جاتے تھے۔میں بھی لنگر کھانے چلی جاتی۔شروع شروع میں پیدل چلتے دربار دُور لگا۔پھر وہ نزدیک آتا گیا۔پھر تو وہ بالکل ایک ہاتھ کی دُوری پر رہ گیا۔ہم یوں جاتے' کھاتے' اور گھر آ جاتے.....بس اتنی سی مشقت.....

سفیدا ہر وقت اپنے کبوتروں اور دوسری چھتوں کی کبوتریوں یعنی جھوکریوں پر نظر رکھے رکھتا۔نام نہ جانے کیا تھا اس کا۔سفیدا بھی یوں کے بال تھے اس کے ہلکے بھورے۔بھنوؤں کے بھی۔جیسے سرد خانے کا مردہ۔گورا رنگ جیسے سارے جسم پر پھلیری پھیل کر چھل گئی ہو۔وہ اس بستی کا سب سے خوبصورت ''کھکھا'' اور میں اس کی کھکھی۔

اماں بتایا کرتی تھی کہ نانی کے بیٹے ہو ہو کر مر جاتے تھے۔ایک اللہ ماری اماں بچ گئی۔اماں کی کارگردگی یہاں بھی صفر رہی۔جب لڑکے ہو ہو کر مر جاتے تھے تو اماں کو کیا پڑی تھی زندہ رہنے کی۔نہ وہ آتی نہ ہم آتے نہ ''میں کھکھی'' بنتی۔

جب میں نے تنگ و تاریک ڈربوں میں گھسنا شروع کیا۔تو مجھے نت نئی باتیں بتائی جانے لگیں۔کہ جہاں میں بیاہی ہوں ارے وہی سفیدے کے وہ میرے نانا نانی کا گھر ہووے تھا۔دونوں آگے پیچھے مر گئے تو اماں نے اپنے چچا کے بیٹے کو دے دیا۔''

''دیا نہیں تھا بٹو! تمہاری اماں غم میں ہووے تھی۔ان کم بختوں نے اس دکھیاری سے غم میں انگوٹھا لگوا لیا۔''

تیسری نسل آباد تھی اس حویلی میں۔کچھ باقیات پہلی نسل کی بھی موجود تھی جو لٹے پٹے آئے تھے۔اور اس حویلی کے کمروں' دالانوں' برآمدوں' احاطوں میں مقیم ہو گئے تھے۔چھوٹے گھرانے بڑے بڑے کنبے بن گئے۔حویلی بستی بن گئی۔حد تو یہ کہ یہ چھ سات فٹی پرچھتیاں تک کنبوں سے آباد تھیں۔کہیں فلاں کے لڑکے کی فلاں بہو آباد تھی۔کہیں نجانے کس پھوپھا کی بیوہ جوان پوتی کے ساتھ۔کہیں اماں کے تایا' چچا کی آل اولاد کہیں کوئی کہیں کوئی۔اتنے لوگ تھے.....اتنے کنبے.....اتنے بچے.....اتنے گھر جیسے ہتھیلی بھر زمین پر کسی نے جھاڑو کے تنکے بکھیر دیئے ہوں۔

خدا جانتا ہے مجھے تو شکلیں یاد ہونے میں نہیں آ رہی تھیں۔کہاں ان کے نام یاد رکھتی۔اور خدا یہ بھی جانتا ہے کہ مجھے جانا کہیں ہوتا میں گھس کہیں جاتی۔ہوتا یوں کہ اُوپر کی چھت کی پتلی گلی سے دو سڑھیاں نیچے اتر کر دو تین گلیاں پار کر کے' ایک گھر کے چھجے سے جو ان کا باورچی بھی تھا' سے گزر کر نیچے والی سڑھی پر آتی اور نیچے کی سرنگ میں گھس جاتی۔اس سرنگ میں کم و بیش آٹھ گھر تھے۔ایک گھر تو ابا والے گھر میں جو بیڈ تھا اس جتنا تھا۔وہیں کمرے میں غسل خانہ' ایک طرف چولہا' اور دوسری طرف کونے میں دو چار پائیاں اُوپر نیچے رکھی تھیں۔کچھ گھروں کی دیواریں ٹین کی تھیں۔اور انہی کے بچے کافی بے شرم اور بے غیرت تھے۔بستی کے سارے بچوں کو وہی بگاڑ رہے تھے۔کچھ کے غسل خانے بہت ہی زیادہ ''بے غسل'' تھے۔ان میں اتنی آسانی سے تانک جھانک ہو جاتی کہ جیسے مانو اپنے کمرے میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے ہوں.....

ان بستی والوں کو پرندہ بانی کا بھی بہت شوق تھا۔قید کر کے رکھنے کے شوقین تھے۔آقا بننے کی زبردست خواہش پائی جاتی تھی ان میں۔

ویسے میں سفیدے اوروں کی بات کر رہی تھی۔تو سب نے اچھی غیرت دلوائی کہ جی ان کا حصہ ضبط کر کے بیٹھ گئے ہو۔اب بیٹی آئی ہے دینا کی۔حصہ دوا سے اس کا۔دوا سے اس کا گھر۔رہے وہ اپنے گھر میں۔

سفیدے اوروں نے سوچا کہ نکاح نہ کیا تو خاندان والے بتا ہی دیں گے کہ ''بٹیا مزے سے رہو نانا نانی کا گھر تھا اب تمہارا ہے۔''

کسی کا تو یہ بھی کہنا ہے کہ بات تو صرف گھر رکھنے کی ہو رہی تھی کہ لڑکی کو تم سنبھالو۔ان کی اماں کا گھر بھی سنبھالا ہے نا۔''

انہوں نے سوچا دو بول ہی پڑھوانے ہیں نا سفیدے سے پڑھوا دیتے ہیں۔کسی اور نے اپنے لڑکے سے پڑھوا دیئے تو مکان سے بھی جائیں گے۔

''نکاح اور اس سفیدے سے'' بوا کی بیوہ بیٹی کی لڑکی ہنسی۔''اسے تو ہم ہش ہش کر کے بھاگا دیتے ہیں۔جہاں دو لڑکیاں دیکھتا ہے.....ہاہا.....بس اب خود ہی جان لینا.....کھکھی تو ہو ہی گئی ہو.....سفیدی بھی ہو جاوگی۔''

☆ ☆ ☆

نویں جماعت میں نے پاس کر لی۔ابا نے دوسری شادی کر لی۔شکیل کسی دوست کے ساتھ رہنے لگا۔شکیل اگر میرے لیے کھڑا ہو جاتا تو مجھے ایسے ہجرتی خاندان میں آ کر نہ رہنا پڑتا۔جو سب کچھ غصب کر کے بھی بھوکے ہی تھے۔جو ایسے خالی ٹین ڈبے تھے جن میں تازہ ہوا تھی نہ باسی اخلاق۔سب کے سب کپڑوں سے ڈھکے ہوئے تھے پھر بھی ننگے۔طہارت خانوں کی طرف جاتے ہوئے پھر بھی غلاظت باہر پھیلاتے ہوئے۔

مرد' بڑے بوڑھے' ہٹے کٹے گھروں میں گھسے رہتے۔کچھ کبوتر پالتے کہ کبوتر نہ ہو گئے عربی گھوڑے ہو گئے۔پھاٹک سے باہر چارپائیاں بچھا کر تاش کھیلتے' حقہ پیتے' گالی گلوچ' تانکا جھانکی کرتے۔کوئی ایک آدھ سبزی کی ریڑھی لگاتا تھا۔کسی ایک کی چھوٹی سی پرچون کی دکان تھی۔گھروں کی باگ دوڑ عورتوں کے ہاتھوں میں تھی۔کچھ صبح ہی گھروں سے کام کے لیے نکل جاتیں۔کچھ گھر بیٹھے کرتیں۔لڑکے

چھتوں پر چڑھے رہتے۔لڑکیاں کھڑکیوں' چوباروں میں ہمہ وقت ٹنگی رہتیں ۔جیسے گھروں میں نہیں منڈی کے چوباروں میں کھڑی ہوں۔ گجروں اور گھنگروں کی چاہ کو دبائے بات بے بات ہنسیں جاتی ۔خیر ہنستیں تو میری جماعت کی لڑکیاں بھی بہت تھیں۔لطیفے سناتیں' ایک دوسرے پر پانی پھینکتی' چوٹیاں کھینچتیں' چٹکیاں بھرتیں۔پھر بھاگ بھاگ کر ایک دوسرے کو پکڑتیں۔میں ہونقوں کی طرح ان کی شکلیں اور حرکتیں دیکھتی۔

''جمیلہ! ہنسا کرو اور نہیں تو بول ہی لیا کرو۔'' استانی جی کہتیں۔

میں بولتی تھی۔اور جو میں بولتی تھی اسے سننے والے کان کسی کے پاس نہیں تھے۔جماعت میں بیٹھتی تو عجیب سا لگتا پھر سوچتی۔

''ارے کہاں یہ ننھی منی بچیاں.....کہاں میں عورت.....میرا یہاں کیا کام.....''

جمیلہ یہ کیا ہوا؟ ساتھ بیٹھی لڑکی نے آنکھیں پھاڑ کر میری گردن کو گھورا۔میں نے ہونقوں کی طرح الٹا اسے گھورا

کس نے گاڑے ایسے دانت.....کون کاٹتا ہے ایسے تجھے.....؟؟

''توبہ! دسویں جماعت کی لڑکیاں بڑی کیوں نہیں ہوتیں۔میں بڑی ہوگئی تو یہ کیوں نہیں؟

میں نے اسکول چھوڑ دیا۔روز روز کیا کیا چھپاتی۔

پڑوسن خالہ آئیں۔ادھر ادھر کے بیماری زدہ' ویلوں' نکموں' تاش کھیلتوں کو اکھٹا کیا۔پنچائیت لگائی۔ویسے یہ زیادتی تھی جو عورتیں گھر سنبھال رہی تھیں پنچائیت بھی انہیں ہی سنبھالنی چاہیے تھی۔یہ کیا بات ہوئی کہ مرد ''بے کار'' ہو کر بھی بدحال نہیں ہوتا۔پنچائتوں میں اسے پھر ''سردار'' بنا کر بیٹھا دیا جاتا ہے۔عورتیں ''کارآمد'' ہو کر بھی ''ناکارہ'' ہی رہتی ہیں۔

یہ کیا تماشہ کیا تم لوگوں نے۔زبان کا پاس ہی رکھ لیتے۔اتنی سی بچی پر کچھ رحم کرتے۔اور نہیں تو دنیا دکھاوے کو ہی اسے دلہن بنا دیتے۔کوئی باجے گاجے کر لیتے۔'' خالہ بھڑک بھڑک جا رہی تھیں

سب جواب دینے کی بجائے خباثت چھپا کر سر ہلانے لگے۔کئی مردوں نے تو ایک دوسرے کو آنکھ تک ماری۔ہونہہ.....جو ہونا تھا وہ ہو گیا تھا۔سفید امیرا شوہر بن گیا۔

☆ ☆ ☆

تیسری منزل پر جہاں اس کے کبوتروں کا گھڈا تھا۔وہیں پانچ چھ فٹی جگہ خالی پڑی تھی۔تین اطراف دیواریں' ایک طرف ٹاٹ کا پردہ۔ان چاروں پر ٹین کی چھت اور بناء چوکھٹ دروازے کے ''کمرہ'' نئی دلہن جمیلہ کو دے دیا گیا۔میں باقاعدہ مسز کھکھا بن گئی۔بٹیا سے بٹو' اے دینا کی' گڑیا رانی سے ''اے دلہن' اری دلہن' سفیدے کی دلہن' بن گئی۔مجھے مبارک ہو میں دلہن بن گئی۔

''اماں باوا اندھے تھے یا تم نے کوئی گل کھلایا تھا؟'' پڑوس کی لڑکی پوچھ رہی تھی۔

''اماں باوا کا تو پتہ نہیں۔ہاں پیدا ہونے کا گل ضرور میں نے کھلایا تھا۔'' میں نے گردن کی چھلی کھال کو دوپٹے سے چھپا کر کہا لیکن لڑکی وہ بھی سیانی تھی۔مسکرا دی۔

''اس حویلی کے سارے مرد عورتوں کا کھاتے ہیں اور عورتوں کو بھی۔''

''سفیدے نے مجھے بھی کھانا شروع کر دیا تھا۔''

سفیدے کی اماں روز صبح حویلی کی دوسری عورتوں کے ساتھ نکلتی اور ڈھونڈ ڈھانڈ کر کام لے کر آتی۔کبھی ستارے موتی ٹانگنے ہوتے' کبھی اونی سوئیٹروں کے ڈھیر کے ڈھیر اُدھیڑ کر گولے بنانے ہوتے۔کبھی ہوٹلوں کی منوں سبزی کاٹنی ہوتی۔اور کبھی پاپڑ تل کر انہیں شاپر میں پیک کرنا ہوتا۔سارا دن گزر جاتا اور پتہ بھی نہ چلتا۔اور کیا چاہیے تھا مجھے۔

مہینوں بعد شکیل بھی آ جاتا اور چند ہزار پکڑا جاتا۔وہ پڑھ بھی رہا تھا اور دو دو نوکریاں بھی کر رہا تھا۔بڑی باتیں کرنے لگا تھا۔ایک بار میرے پیر پکڑ کر معافی مانگنے لگا۔میں نے جھٹ معاف کر دیا۔اور کیا کرتی۔جو کر سکتی تھی وہ کر دیا۔

کئی بار شکیل نے سفیدے کو ساتھ لے جانا چاہا کہ'' آ و کسی کام پر لگا دوں۔'' پر سفیدا کہتا تھا کہ اپنی پک اپ لے گا یا جنرل اسٹور کھولے گا۔شکیل کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ اسے پک اپ یا اسٹور کے لیے دے دیتا۔میری ساس نے کہا کہ لڑکی کو جہیز نہیں دیا تو چلو کوئی ماں کا زیور ہی لا کر دے دو۔ہونہہ.....جیسے ہیرا تھا نا ان کا بیٹا کہ میں ماں کے ''سونے'' میں تولتی۔گھر سے بھاگتے ہوئے میں اماں کا زیور ضرور لے آتی اگر وہ دادی کے قبضے میں نہ رہا ہوتا۔وہ زیور دادی کے لمس سے پاک ہوتا تو وہ اب میرے پاس ہوتا۔دادی سے یاد آیا میری کوئی دُور پار کی دادی ساس آتے جاتے میری کان کاٹتے بہت خوش ہوتی تھی۔

''اری دلہن بات سنیو!''

میں نے ایک دو بار سن لی۔پھر چپکے سے نکل جاتی۔بات ہی ایسی ہوتی کہ میرا خون جلا دیتی۔ایک دن اپنی جیسی بڈھیوں کو جمع کیے بیٹھی تھی۔میری شکل دیکھتے ہی کہنے لگی۔کہنے کیا لگی ''چسکے کے سوٹے'' لینے لگی۔

''اے بہو تم تو نہ بچہ دیتی ہو نہ انڈا.....کچھ تو دو.....''

بڈھیوں کا مجمع دل کھول کر ہنسا۔بات کہاں سے نکلی کہاں جا پہنچی کہ بستی والوں کا محبوب چٹکلہ بن گئی۔خوب داد وصول کی اس ''انڈے بچے'' نے۔کہ آتوں کو بھی سنائی جاتی اور جاتوں کو بھی۔سوغات ہوگئی کہ مہمانوں کے آگے بھی پیش کرنی اور مہمان بن کر بھی لے کر جانی۔

ایک دن یہی دادی بیٹھی تھی میلاد میں۔سب بیٹھے چاول کھا رہے تھے میں نے سفیدے سے کہا

دادی مجھ سے پوچھتی ہیں کہ میں نا انڈا دوں نہ بچہ۔تم ہی انہیں بتا دو۔

سفیدے نے سب کے سامنے گرم چاول میرے منہ پر دے مارے اور رات کو گھونسے۔مار لو.....جتنا جی چاہے مار لو۔نہ تم خود روکو گے نہ تمہیں کوئی روکے گا.....باپ سے کھائی تھی نا تو شوہر سے کھانی بھی بنتی تھی۔بیٹی بن کے لچی تھی تو بیوی بن کے بھی وہی رہنے والی تھی۔

☆ ☆ ☆

بستی میں تازہ تازہ میرے جیٹھ کی مرگ ہوئی تھی۔ پانچ لڑکیاں چھوڑ کر مرا تھا۔ رات بھر جوا کھیلتا' دیسی شراپ پیتا' دن میں پڑا سوتا رہتا۔ یہ وہ انسان تھا جو جہاں جس کا بستر دیکھتا' بلکہ خاص کر عورتوں کو وہیں مستا کر گر جاتا۔ ادھر ادھر والیاں تو اسے جوتوں کے تلوے سنگھا کر ہوش میں لاتیں۔ پر باز پھر بھی نہیں آتا تھا۔ مستا کر کسی نہ کسی پر جا گرتا۔

جوئے کی ہی کسی لڑائی میں کسی نے پیٹ میں دو گولیاں مار دیں۔ جب لاش آئی تو بھابھی مزے سے سکتے میں چلی گئی۔ بچیاں کہیں اندر باہر کھیلتی رہیں۔ بھابھی کا سکتہ میت کے اٹھنے کے بعد تک قائم رہا۔ میری دادی ساس اور اس کے ساتھ کی بڈھیوں نے یہ رکھ رکھ کر اسے مارا۔ اس کے بال نوچے۔ کہ رو لے مردود نی.....رو.....رو.....

پر وہ نہ روئی۔ دکھ ہوتا تو روتی۔ پھر ایسے شوہروں کے مرنے کا دکھ ہوتا کسے ہے۔ جنازہ اٹھا۔ رات ہوئی اس نے چپکے سے سکتہ توڑا ۔ایک پلیٹ چاول کی اٹھائی اور کمرے میں بند ہو گئی۔ صبح میں نے اسے بے سدھ سوے دیکھا۔ صبح افسوس کرنے والیاں آ آ کر اس کے گلے سے لگیں۔ اور وہ دو چار چیخیں مار کر پھر سکتے میں چلی گئی۔

اتنی ذہین اور مکمل بیوہ میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی تھی۔ دل چاہا تالیاں بجاوں۔ لیکن بستی والے تالیاں بجانے کے لیے تیار نہیں تھے۔

''اے توبہ! یہ تو پھر سکتے میں چلی گئی۔ آج تو کوئی رونا پیٹنا کر لیتی۔ اس کا سائیں قبر کی مٹی سے مٹی ہو رہا ہے۔ یہ رو کر نہیں دے رہی۔ کوئی مرے کوئی جیے انہیں بہترے۔'' دادی ساس اپنی ہانکنے لگیں۔

مرحوم دو چار بار مستا کر مجھ پر بھی گرے تھے۔ میں نے لیٹرین کا تیزاب لا کر تھوڑا سا چھڑک دیا منہ پر۔ بھاگتا پھرا پھر سرکاری ہسپتال میں۔ دوبارہ مجھ پر مستا کر نہیں گرا۔ کمانا نہ دھمانا اور مستا کر گرتے رہنا۔ بڑے کمینے تھے ویسے۔ عورتوں کی کمائی راس تھی' عزت نہیں۔

بھابھی سر شام ہی کمرے کی کنڈی لگا کر بچوں کو کھانا کھلا کر فارغ کر دیتیں۔ مجھے بھی اندر بلا لیتیں اور ہلکی آواز میں ریڈیو سنتیں۔ یہ سر شام ہی کمرے میں بند ہو جانے والا قصہ بھی بعد میں کھلا۔ بھابھی اپنے منہ سے کچھ نہیں بتاتیں تھیں مجھے۔ بچی سمجھتی تھیں۔

جیٹھ سے چھوٹا' سفیدے سے بڑا ایک بھائی اور تھا ان کا۔ کبڑا تھا اور ایک پیر بھی ٹیڑھا تھا۔ اچھا خاصا پتھر کے زمانے کا انسان لگتا۔ سب اسے مستو کہتے۔ ہاں لیکن میری ساس اسے مست ملنگ کہتی۔ کئی کئی ہفتے' مہینے غائب رہتا' کبھی کبھار گھر آ جاتا۔ جس دن پہلی بار مجھ سے ملا میں اپنے دھیان سے بیٹھی تھی ایکدم سے میرے گلے میں پڑے دوپٹے پر ہاتھ ڈالا.....افف دوپٹے پر ہی تو نہیں۔

اے! اسے سر پر لے.....

میں چلاتی ہوئی نیچے بھاگ گئی۔ نیچے والیاں ہنسنے لگیں۔

ارے اللہ لوک ہے۔ ڈرومت' مست ہے' نماز روزے اور سر ڈھانپنے کو کہتا ہے' درباروں پر رہتا ہے نا'' ساس نے ہنستے ہوئے کہا۔

اچھا اللہ لوک ہے۔ میں تو اس رات نیچے کی سرنگ کے کسی کے گھر میں جگہ بنا کر سو گئی۔ اب یہ مستو جیٹھ کے مرنے کے بعد مستقل ہی گھر میں رہنے لگا تھا۔ دن کو غائب رہتا رات کو یاد سے گھر آ جاتا۔ روز بھابھی کے گھونسے' جوتے کھاتا پر باز نہ آتا۔ ساس کو بتایا' سسر کو سمجھانا چاہا۔ پر بہت سیدھے تھے دونوں سمجھتے ہی نہیں تھے۔ اور دونوں کا مست آتے جاتے کمر عمر بچیوں کے الاسٹک والی شلواریں کھینچتا پھرتا۔ موقع ملتے ہی ہاتھ دکھا جاتا۔ درفٹ۔ دودھ پلاتی عورتوں کو نظریں گاڑے دیکھتا رہتا۔ زیادہ مست ہو جاتا تو بچوں کو اٹھا اٹھا کر ماؤں کی گودوں میں دیتا اور ہاتھ سے اشارے کرتا۔ منہ سے بکتا۔ وہی سب کہ نہ دیکھنے والا نہ سننے والا۔ ایسے واہیات اشارے..... خیر وہ سب تو پکی ہوئی تھیں لات مار کر پرے پھینکتیں۔ بھابھی بھی یہی کرتی۔ پھر سر شام کمرہ بند کرنے لگی۔

''کتا روز رات کو میری جان کھانے آ جاتا ہے۔ ہندوستان کے سارے غیرت' بے شرم اسی حویلی میں مرے پڑے ہیں۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے کہ غیرت شرم ان ہی گھاٹوں پر چھوڑ آئے۔'' بھابھی غصے سے باولی ہو جاتی۔

یہ درباری مجاور مستو ایک بار رات گئے بھابھی کا دروازہ بجا رہا تھا۔ میں اوپر کھڑی تھی۔ میری طرف دو بار دیکھا پر باز نہیں آیا۔ میں نے بھی چھت پر پڑا ایک موٹا سا ڈنڈا اٹھا کر تاک کر مار دیا۔ کتے کے پلے کی طرح بلبلانے لگا۔ کھانسی زدہ سسر اٹھے۔ ہش ہش کرنے لگے ۔ساس نے پوچھا کیوں اُٹھے۔ بولے بلی ہے۔

''کیوں ہش ہش کرتے ہو۔ چپ رہو بس۔'' ساس نے سمجھداری سے کہا۔

آٹھ دس دن بھابھی کو سکون رہا۔ وہ بے چاری سارا سارا دن فیکٹریوں میں کام ڈھونڈ کر لے کر آتی۔ پہلے شوہر اس کے پیسے نکال کر لے جاتا تھا۔ دیسی شراپ پی کر روئی کا گدا سمجھ کر دھنکتا۔ اب مار سے آرام ملا تو یہ مستو آ گیا۔ بھابھی نے لکڑی کے دیمک زدہ دوازے پر لکڑی کے مضبوط تختے لگوائے۔ اندر سے دو دو کنڈیاں لگوائیں۔ موٹا تالا لگاتیں اور سو جاتیں۔ صبح ہوتے ہی نکل جاتی۔ مردانہ وار کام کرتی تھی۔ ویسے چڑیا کی طرح ڈری سہمی رہتی تھی۔

''بڑا ڈر لگتا ہے جمیلہ! دل کرتا ہے بے غیرت بن جاوں ادھر ادھر منہ ماروں۔''

مجھے بھی بڑا ڈر لگتا ہے بھابھی۔ پر میرا دل چاہتا ہے ادھر ادھر کے سارے بے غیرتوں کو مار دوں۔''

☆ ☆ ☆

آپا آئی تھی میرے گھر۔ وہی پھوپھی والی عادت۔ شادی تھی کسی کی لاہور میں۔ آپا پھوپھی کے ساتھ آئی تھی۔ پھوپھی ابا اور تایا سے ملنے چلی گئی اور آپا یہاں آ گئی۔ حویلی میں گھستے ہی ان کے چہرے کے رنگ بدلنے لگے۔ اتنی اچھی حویلی انہیں پسند نہیں آ رہی تھی۔ البتہ بھابھی سے مل کر آپا بہت خوش ہوئی۔ میں کھانا پکاتی رہی۔ بھابھی کمرے میں آپا سے پتا نہیں کیا کیا باتیں کرتی رہی۔ پھر آپا آئیں اور مجھے گلے سے لگا کر رونے لگی۔ چپکے سے چند ہزار جو خود اس نے جانے کیسے جمع کیے تھے پکڑا دیئے۔

کھانے کے بعد میں برتن دھونے لگی۔ اور سفیدا آپا کو اوپر لے گیا کہ آو کبوتر دکھاوں۔ جب سے آپا آئی تھی آپا کے پیچھے پیچھے ہی ہی تھا۔ حویلی کے مردوں کی تو عید ہو جاتی جب کوئی ''نئی نکور عورت'' مہمان بن کر آ جاتی۔ ایک وہی تو ہش ہش نہیں کرتی تھی۔ بھابھی پیچھے

لپکی پر ذرا دیر ہو چکی تھی۔

بھابھی نے آخری سیڑھی سے سر نکالا اور دھاڑی۔اس دھاڑ سے پہلے ہی آپا بری طرح سے ڈر کر سفیدے سے دُور ہو چکی تھیں۔ہانپی کانپتی بے چاری نیچے آئی۔

کوئی بچی' لڑکی' عورت ان سفیدے اوروں کے ہاتھوں سے بچی تھی جو آپا بچ جاتی۔آپا فوراً جانے کے لیے تیار ہو گئی۔معصوم کے ہاتھ کانپ رہے تھے برقع پہنتے ہوئے۔میں تو خود چاہتی تھی وہ چلی جائے۔کیوں ملنے آئی تھی وہ مجھ سے؟

سفیدے نے کہا وہ تیرا نانا رنڈی باز اور ایک تو بھگوڑی جو گھر سے نکل آئی۔تیرے بھائی بھگوڑے پتا نہیں کہاں کہاں منہ کالا کر رہے ہیں اور تو میرے منہ پر کالک تھوپ رہی ہے۔''

یہ اچھا تھا نانا سے میں ملی نہ جلی اور ہر بات میں وہ آجاتے تھے مجھے زلیل کرنے۔حویلی کے باقی ڈربوں کے مکین تو قسم کھا کر کہتے تھے کہ نانا جیسا شریف' تہجد گزار' پاک باز اس پورے خاندان میں نہیں تھا۔اسی نے حکومت سے یہ حویلی الاٹ کروائی۔دو بھائیوں اور بیوہ بہن کو پناہ دی۔وہ رنڈی ہندنی تھی۔سنتالیس میں کسی مسلمان کے ہاتھوں برباد ہوتی ہواتی کوٹھے جا پہنچی۔بابا نے اسکی کہانی سنی تو وعدہ کر لیا کہ بارڈر پار کروادیں گے۔وہ کہنے لگی

''اب کیا منہ لے کر بارڈر پار کروں گی۔عزت کی روٹی دے دو میاں جی۔''

منہ اندھیرے دروازے پر کھڑی کہہ رہی تھی۔نانی نے بڑھ کر استقبال کیا۔سینے سے لگایا۔بے چاری حویلی کے ایک کونے میں دبکی اپنی پوجا پاٹ میں لگتی رہتی تھی۔یہی نیکی کی اس نے اور وہ رنڈی باز ہو گیا۔بات مسجد کے امام اور نمازیوں تک جا پہنچائی۔کہاں کی تہجد اور کیسی کی شرافت۔لاکھ صفائیاں دینے پر بھی کوئی نہ مانا تو دلبرداشتہ ہو کر لٹک گئے۔

شاید نانا کے بھائیوں کو یہ ڈر تھا کہ ہندنی کو مسلمان کر کے میاں جی نکاح ہی نہ پڑھوالیں۔پہلی والی کے لڑکے ہو ہو کر مر جاتے ہیں۔ضروری نہیں کہ دوسری والی کے بھی لڑکے ہو کر مر جائیں۔اگر لڑکے ہو کر نہ مرے تو انہیں مرنا پڑے گا۔جب ساری حویلی وارثوں کو دینی پڑے گی۔یوں اگلے پچھلوں نے حویلی سنبھال لی۔ادھر ادھر کے درو پار کے رشتے داروں کو حویلی کے حصے تھوڑے تھوڑے کر کے بیچ دیئے۔ایسے ہی تو حویلی بستی نہیں بن گئی تھی۔

میں یہ بات کر رہی تھی کہ سفیدا الٹا نانا نانی' اماں شکیل' عقیل کے قصے لے کر بیٹھ جاتا ہے۔نہ اپنا بڑا بھائی دیکھتا ہے نا باپ اور نہ وہ پدی سی دو بہنیں۔یہ بھر بھر کر نیازوں کی پلیٹیں آتی تھیں دونوں کے لیے۔خدا ہی جانتا تھا کہ صبح و شام وہ کون سے ختم شریف دلائے جاتے اور صرف انہی کے لیے پلیٹیں بھر بھر کر آتیں۔دوکانوں پر بوتل لینے جاتیں تو بھر بھر شاپر اپنے دوپٹے کی بکل میں چھپا کر لاتیں۔

ایک تازہ واقعہ تو سنایا ہی نہیں۔دو چھتیں چھوڑ کر سفیدا اور کبوتری (شادی شدہ) پکڑے گئے۔اس کے شوہر نے تو وہ بجایا دونوں کو کہ سب نے اپنی اپنی چھتوں پر چڑھ کر جی بھر کر یہ تماشا دیکھا۔میرے اور بھابھی کے تو ہنس ہنس کر پیٹ میں بل پڑ گئے۔

وہ تو مرنے مارنے پر تلا تھا لیکن سسر جی نے سفیدے کو کسی جاننے والے کے یہاں دوسرے شہر چلتا کیا۔اب سکون

ہے.....سفیدے سے.....جمیلہ کو.....

میں بھابھی کے کمرے میں سونے لگی۔ایک رات گرمی بہت تھی۔کمرے میں دم گھٹ رہا تھا۔ بھابھی تو عزت کے مارے بے چاری تنور میں پڑی رہتی تھی۔بچیوں کو بھی باہر نکلنے نہیں دیتی تھی۔مجھ میں تھوڑی دلیری باقی تھی۔میں اللہ ماری تیسری منزل پر آ گئی۔اور چار پائی نکال کر لیٹ گئی۔لیٹتے ہی سو گئی اور پھر چیخ ماری اور خوف سے میری گھگھی بندھ گئی۔

میں نے مستو کو پرے دھکا دیا۔میرا گریبان اس کے ہاتھ میں رہا اور پھٹتا چلا گیا۔دوپٹہ گلے میں پھندہ سا بن گیا۔میں جھٹ کبوتروں کے گھڈے میں گھس گئی۔اور اندر سے کنڈا لگا لیا۔میرے جاتے کبوتر پھڑ پھڑانے لگے۔مستو پاگل کتے کی طرح گھڈے کے چکر لگانے لگا۔گالیاں بکتا رہا' دھمکیاں دینے لگا۔میں نے سر گھٹنوں میں دے لیا اور اونچی آواز میں رونے لگی۔

مستو پچکارنے لگا' بہلانے لگا' باہر آنے کے لیے منانے لگا۔جیب سے پیسے نکال کر بھی دکھائے۔میں زمین پر دبکی بیٹھی تھی۔جسم میں ایسی کپکپاہٹ تھی جیسے ہڈیاں کھال چھوڑ رہی ہوں۔مستو پھر گالیاں بکنے لگا۔ میں نے بھی گالیاں دینی شروع کر دیں۔جی ہاں.....میں نے اس اس رشتے اور انسان کو گالیاں دینی شروع کر دیں جس جس کو گالی دینے سے مذہب' معاشرہ منہ بنا لیتا ہے۔قبر کے عذاب اور دوزخ کے درجے گنواتا ہے۔میں نے اپنے باپ سے شروع کیں اور خود پر لا کر روکیں.....اور اپنے بال نوچنے شروع کر دیئے۔

میں کیوں پیدا ہوئی.....

جمیلہ تو کیوں پیدا ہوئی.....

ناخنوں سے اپنا منہ کھرچنا شروع کر دیا۔دانتوں سے اپنے بازو کاٹے۔اس سور نے مجھے ایسا کرتے دیکھا تو ٹھٹھک کر رہ گیا۔رات کے اندھیرے میں جبکہ مردے بھی اپنی قبروں میں سکون سے سو رہے تھے۔زندہ جمیلہ کونے میں کبوتروں میں دبکی سسکیاں لے رہی تھی۔مجھے اماں یاد آ رہی تھی۔پھر فوراً ہی مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔یہ وہی تھی جس کی چپ کا پھل میں کاٹ رہی تھی۔ہاں یہ وہی تھی جو مجھے اس گھڈے میں بند کر گئی تھی۔وہی یہ چاہتی تھی کہ مجھے احترام ملے نہ پناہ۔اور یہ بھی کہ جیسے وہ ہاتھ اٹھا کر تنہائی میں بیٹھی دہائی دیا کرتی تھی میں بھی وہی کروں۔

میں نے دور تک پھیلے اندھیرے کو دیکھ کر دہائی دے دی۔میں نے بھی دونوں ہاتھ آٹھا لیے اور ساتوں آسمانوں ہلا ڈالنے چاہے۔میں ماں جئی بن گئی۔

میرا پھٹا گریبان' اجڑے بال' کانپتا جسم' اس ذرے کی حیثیت اختیار کر گیا جو موجود ہو کر بھی ''ناسور'' ہی ہوتا ہے۔

چھپ کر بیٹھی ہے تھو ہے تجھ پر.....گونگی رہتی ہے.....لاچار بنتی ہے.....تھوتھو.....ڈرتی ہے.....آخ تھو.....

آہستہ آہستہ.....جیسے دبے پاوں ماں جئی بنے مجھے یہ آوازیں سنائی دینے لگیں۔جو شاید میرے حصے کی وحی تھی ورنہ یقیناً الہام۔میں نے ایسی باتیں پہلے سوچیں نہ سنیں۔میرے جسم کی بوٹی بوٹی کے کان کھڑے ہو گئے۔ان کانوں نے کان لگا کر کام کی باتیں سنیں۔

''ایمان پا کر تم جیسوں نے کھویا۔ چاہتے ہو خدا اپنی فوج لے کر آئے تمھاری جنگ لڑنے کے لیے۔ پھر تمہیں خلفیہ کیوں بنایا خدا نے۔ بچاو اور وار ایک ہی ہتھیار سے ہوتا ہے.....ہتھیار والے جانے بچاو کرنا ہے یا وار.....تمہارے اعمال کی پوچھ پڑتال ضرور ہوگی اور تمہارے خوف اور بزدلی پر لعنت بھی ضرور بھیجی جائے گی.....''

''آدم.....آدم نہیں رہے گا تو وہ اس صفت سے منکر ہوگا جس صفت پر اسے اللہ نے پیدا کیا۔ جس جس صفت سے پیچھے ہٹے گا اس اس صفت کا منکر ہوگا۔ کتنی دیر ہوگئی۔ کتنے زمانے بیت گئے۔ کتنی بستیاں اجڑ گئیں۔ نسلیں ختم ہوگئیں۔ ایک انسان کو اس کی صفات پر قائم رکھنے کے لیے۔''

میں ہمہ تن گوش ہوگئی کہ مجھے بتایا جا رہا تھا کہ جنہیں کبوتر سمجھتی ہو، جن میں پناہ لیے بیٹھی ہو وہ جلد ہی گدھ بننے والے ہیں۔ اگر ایسے ہی میں پناہ لیے بیٹھی رہی تو وہ مجھے کمزور جان لیں گے۔ میری آہیں سنیں گے تو ہنسیں گے۔ آنسو دیکھے گے تو مزے لیں گے۔ پھر وہ آگے بڑھیں گے اور نوچ لیں گے.....

مستو اب نیچے جا رہا تھا.....

میں اٹھ کھڑی ہوئی اور گھڑے میں کبوتروں کے بیٹھنے کے لیے رکھی موٹی لوہے کی سلاخ کو زور لگا کر نکالنا چاہا جو آسانی سے نکلنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ٹھیک ہے آسان تو کچھ بھی نہیں ہوتا.....

سلاخ میرے ہاتھ میں آ گئی.....بہت دیر سے آئی.....

گریبان کو گرہ لگائی۔ دوپٹے سے سلاخ کو اپنے ہاتھ پر باندھ لیا اور گھڑے کا دروازہ کھول کر جھک کر باہر نکل آئی۔ میرا جسم ابھی بھی کانپ رہا تھا۔ بھلے سے کانپتا رہتا۔ چھت کی طرف کی سیڑھیوں کی اوٹ میں مستو ابھی بھی چھپا بیٹھا تھا۔ مجھے اس کا سر نظر آ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں ساری رات گھڑے میں نہیں بیٹھ سکتی۔ ٹھیک جانا اس نے۔ میرے نکلتے ہی مستو چھلانگ لگا کر اوپر آ گیا اور میری طرف لپکا۔ میرا ہاتھ پیچھے کی طرف تھا۔ مستو کے جھپٹتے ہی وہ ہاتھ سامنے آ گیا۔

میں نے نئی نئی اڑان پر نکلی چڑیا کی طرح پورے دل سے ہوا میں غوطہ کھایا۔ دونوں پر پھیلائے اور پورے زور سے سلاخ کو مستو کے سر پر دے مارا۔ مستو آدھ کٹے بکرے کی طرح تڑپا اور پیچھے جا گرا۔ پھر میں نے کمر پر مارا۔ اب مجھ پر جھپٹنے کی بجائے وہ کتے کے پلے کی طرح چوں چوں کرتا نیچے بھاگا۔

☆ ☆ ☆

نیچے بڑا کمرہ جس میں سارا کنبہ سوتا تھا۔ جس کے دروازے کو باہر سے کنڈی وہ خود ہی لگا کر اوپر چھت پر آیا تھا میں وہ مرے ہوئے مچھر کی طرح ڈھیر ہوا۔ سب ایسے ہڑبڑا کر اٹھے جیسے کسی نے ان کے تلووں پر تیل چھڑک کر تیلی لگا دی ہو۔ یکدم بھگدڑ مچ گئی۔ گالیاں بکتا مستو اپنی ماں کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے پیچھے جا کر اس کی دونوں ٹانگوں پر ضرب لگائی۔ سسر نے پیچھے سے آ کر بالوں سے پکڑ کر مجھے پرے گھسیٹا۔ مستو جس کے منہ سے کتوں کی طرح رال ٹپک رہی تھی بھاگ کر باورچی سے بیلن اٹھا لایا۔

بھابھی ہانپتی کانپتی دو دو کنڈیاں کھول کر اپنے کمرے سے باہر آئیں۔نند نے جھٹ دروازہ بند کر لیا کہ حویلی میں سے کوئی اور یہ تماشا نہ دیکھ لے۔

کیا ہوا جمیلہ؟ بھابھی میری طرف لپکی کہ مستو بھونکا

اپنے نانے پر گئی ہے.....وہ رنڈی باز تھا یہ خود رنڈی.....

میں نے کمرے میں موجود سب کی طرف دیکھا۔سسر کی طرف جو مستو کی ہر کرتوت سے واقف تھا۔ساس جو کئی بار مستو کو چھوٹی بچیوں کے ساتھ چھت پر دیکھ چکی تھی۔بھابھی کی طرف جو خود کو اور اپنی بچیوں کو بچاتی سر شام کمرے میں بند ہو جاتی تھی۔

ساس مجھے گھور رہی تھی۔وہی ساس جو کہتی ہے۔''کیوں ہش ہش کرتے ہو۔چپ رہو بس۔''اسی ساس نے گالیاں دینی شروع کر دیں اور کھینچ کر میرے منہ پر چانٹا مارا۔کیونکہ اسے لگا وہاں میں اکیلی ہوں.....ایک.....اکیلی.....

ہاں ٹھیک ہے.....مجھے اکیلا ہونا منظور ہے.....پر ماں جئی نہیں.....

مستو آگے بڑھا اور بیلن میرے پیٹ میں دے مارا۔بھابھی نے مستو کو پرے کرنا چاہا لیکن انیلا' فرزانہ نے بھابھی کو پرے پھینکا۔ساس نے میری چوٹی پکڑ کر گھمانی شروع کر دی۔

''گشتی کی اولاد کو عزت راس نہیں۔بھاگ آئی باپ کے گھر سے۔بڑی عزت والی ہے نا جو بھاگ آئی۔اپنے محلے میں کیا کیا کر کے آئی ہے۔کیا ہوگا.....اسی لیے باپ بڈھے سے بیاہنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ہر وقت چھت پر ٹنگی عاشقوں کو بلاوے دیتی ہے۔کتنی بار میں نے ساتھ کی چھت کے لڑکے کے ساتھ پکڑا.....آج مستو نے پکڑ لیا ہوگا۔''ساس چلانے لگی۔

نجانے کون کون کیا کیا بک رہا تھا۔میں پیٹ لیے زمین پر دہری ہو رہی تھی۔بھابھی کی چوٹی بھی ایک نند کے ہاتھ میں تھی۔مستو مجھے مارنے میرے قریب آیا۔میں نے سارے دردوں کو پرے دھکیل کر دُور گری سلاخ پر جھپٹا مارا۔پوری قوت سے اس کے پیروں پر دے ماری۔

سسر نے جوتا اٹھا لیا۔انیلا' فرزانہ مجھ پر ایک ساتھ بل پڑیں۔ساس اپنے ناخنوں سے مجھے نوچنے لگی۔لیکن میں نے سلاخ نہیں چھوڑی۔سب کو اس کی زد پر رکھ لیا۔

جس وقت ساس نے اپنے دوپٹے کا پھندہ بنا کر میرے گلے میں ڈال کر کسا اس وقت میری آنکھوں کے سامنے اندھیرہ چھانے لگا۔میں نے ایک ہاتھ سے پھندہ ڈھیلا کرنا چاہا کہ مستو آگے آیا اور میرے منہ پر چانٹے مارنے لگا۔

جب ساس پورا زور لگا کر میرا پھندا کس رہی تھی تب ہی میں نے بھی کس کر ہی مستو کے سر پر سلاخ دے ماری۔

سب اس کی طرف لپکے۔بھابھی نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔تقریباً سارے ہی بستی والے اندر آ گئے۔''نوٹنکی دیکھنے''۔اور کر ہی کیا سکتے ہیں یہ لوگ۔تماشا لگا سکتے ہیں یا تماش بین بن سکتے ہیں۔نہ اوپری درجے پر نہ نچلے پر.....ہونہہ.....

میری آنکھیں اندھیرے سے نہیں ''سکون'' سے بند ہو گئیں۔اچھا ہے.....اس دنیا میں رکھا ہی کیا ہے.....

☆ ☆ ☆

اماں کبھی سرہانے بیٹھی نظر آتی کبھی سر دباتے۔اماں یوں ہی آئے دن آتی رہی۔پھر ایک دن عقیل آیا۔یہ لمبی داڑھی' نورانی چہرہ' ۔شہید ہوا لگتا تھا۔گبرو جوان..... پاک باز..... ہمارے باپ کا خون نہیں لگتا تھا.....

کر آئے جہاد.....

اس نے سر ہلایا.....اللہ جانے ہاں میں کہ ناں میں۔

ہو گیا کشمیر آزاد؟

''اللہ کی راہ بہت اچھی ہے جمیلہ'' وہ مسکرایا بھی۔

میں نے آنکھیں موند لیں.....اللہ کی راہ.....مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے کہ اللہ کی راہ کتنی دلفریب ہے.....

جمیلہ چلے گی میرے ساتھ؟

اگلی بار آیا تو پوچھا میں نے ہاں میں سر ہلا دیا

تجھے اپنے پاس رکھوں گا۔تیرا منہ اپنے ہاتھوں سے دھویا کروں گا۔بالوں میں کنگھی کروں گا۔منہ میں نوالے بنا بنا کر ڈالوں گا۔لوریاں سناؤں گا.....میٹھی نیند سلایا کروں گا.....

سناؤ لوری میں سونا چاہتی ہوں.....

اس نے میرا سر سہلانا شروع کر دیا۔اور حمد پڑھنے لگا۔مجھے گہری نیند آ گئی۔اس نے میری گیلی آنکھیں اپنی پوروں سے صاف کیں۔پھر اندھیرہ چھا گیا۔آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرہ تھا۔بڑا صدمہ ہوا۔آنکھ کھلنے کا بڑا صدمہ ہوا۔اس دنیا کا وہی پرانا نظارہ۔میں نے آنکھیں بند کر لینی چاہیں۔

☆ ☆ ☆

جمیلہ.....جمیلہ.....'' وہ اس کے گال تھپک رہا تھا۔

جمیلہ کو آنکھ کھولنی پڑی۔عقیل اس کے سامنے بیٹھا تھا۔اس کے جسم میں درد تھا' بہت درد تھا۔لیکن یہ درد جتنا زیادہ تھا اسے اتنا ہی پیارا تھا۔اس کا بستر اجنبی تھا۔اس نے آس پاس نظر دوڑائی۔کمرے کی دیواروں سے ہوتی ہوئی اس کی نظر کمرے کے باہر تک گئی۔اس چھوٹے سے کمرے اور باہر کے نظر آنے والے منظر سے اسے یاد آنے لگا کہ بڑے سے کنبے کا یہ چھوٹا سا گھر بھابھی کا میکہ ہے۔

عقیل اس کے گال پیار سے تھپک رہا تھا۔چند دن ایسے ہی آنکھیں کھلتی بند ہوتی رہیں۔بھابھی' بچے' عقیل' شکیل گاہے بگاہے نظر آتے رہے۔دوبارہ اس نے آنکھیں کھولیں تو عقیل گیلے تولیے سے اس کا منہ صاف کر رہا تھا۔پھر وہ اس کے بال سنوارنے لگا۔بچیاں اور بھابھی کمرے میں کھڑیں اسے دیکھ رہی تھیں۔بھابھی تو رو بھی رہی تھی۔

میں گاڑی کا انتظام کر کے بیٹھا ہوں جمیلہ۔جلدی سے ٹھیک ہو جا کہ سفر کر سکے۔باقی تو وہاں جا کر ٹھیک ہو جائے گی۔

کہاں؟

میرے گھر.....اماں کے گھر.....

ہماری اماں؟

جہادیوں کی اماں۔میں نے اماں کی بات مان لی۔اماں نے کہا جاو میری بچیوں کو لے آؤ۔آپا کے پاس گیا تھا وہ نہیں مانی۔کہتی ہے بچوں کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی اور تو جمیلہ۔تو چلے گی میرے ساتھ.....اماں کا چھوٹا سا گھر ہے۔روٹی کبھی کبھی ملتی ہے ہمیں۔ٹھنڈ سے ہڈیاں جڑ جاتی ہیں۔میری تو پیروں کی دو انگلیاں چھڑ گئی ہیں۔جمیلہ وہاں کھانے کو روٹی نہیں' جلانے کو لکڑیاں نہیں' کمانے کو روزی نہیں پھر بھی وہاں زندگی ہے۔اماں چھوٹے سے کھیت میں کام کرتی ہیں۔سبزیاں اگاتی ہے۔ہمیں کھلاتی ہے۔چلو گی میرے ساتھ؟

میں اپنے بچوں کے بغیر نہیں جاوں گی۔''

عقیل چپ ہو گیا۔بہت دیر بعد بولا جب بھابھی کمرے سے چلی گئی۔''اور ان کی ماں؟''

بھابھی سے نکاح کر لو عقیل۔انہیں بچالو.....

عقیل کا نورانی چہرہ دھندلا سا گیا۔تھوڑی دیر لگی پھر وہ دمک اٹھا۔

ٹھیک ہے جمیلہ.....یہ جہاد ہی سہی.....تو بس میرے ساتھ چل.....وہاں کھلی چراگاہیں اور اونچے پہاڑ ہیں.....

کیا وہاں کے چشموں میں مچھلیاں ملتی ہیں.....؟

میں نے کبھی پکڑی نہ کھائیں۔''عقیل ہنسنے لگا۔

مجھے چشموں سے مچھلیاں پکڑنے دو گے؟

ہاں۔

اور کشمیری سیب.....؟

سرخ وشریں.....

اور کشمیری بچے؟

غیرت منداور جرات والے.....بڑے پیارے ہیں.....

اور کشمیری بچیاں.....؟؟

وہ پہاڑوں پر جھٹ پٹ چڑھ جاتی ہیں.....

ٹھیک ہے میں چلوں گی.....ضرور چلوں گی.....ہر کشمیری لڑکی کے ساتھ پہاڑوں پر چڑھنے.....سرخ وشریں پھل کھانے.....

☆ ☆ ☆

بچیاں اور بھابھی گاڑی میں ہی بیٹھے رہ گئے تھے۔عقیل میرے ساتھ اندر آنا چاہتا تھا لیکن میں نے منع کر دیا۔جس وقت میں نے

بڑا پھاٹک پار کیا اسی وقت جس جس کی مجھ پر نظر پڑی وہ میری طرف لپک کر آیا۔ میں نے بستی کی چند عورتوں اور چھوٹی بچیوں کی نگاہوں کو خود کو سلامی دیتے دیکھا۔ انہیں مجھ پر فخر تھا۔ میں ان کا وہ دبنگ ہیرو تھی جو وہ کو نہیں بن سکی تھیں۔

ادھر ادھر سے سب کونے کھدروں سے نکل کر میرے ساتھ ہوتی گئیں۔ اوپر کے چھوٹے گھروں سے گزر کر میں نانا کے گھر آ گئی۔ سامنے ہی مستو بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس کے سر' ہاتھ' پیر پر پٹیاں بندھی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی چلانے لگا۔

اماں.....اماں.....اسے دیکھ.....یہ.....

اس کی ماں اس کی دل دہلا دینے والی آواز سن کر باورچی سے نکلی۔ اس کے نکلنے سے پہلے ہی میں نے کمرے میں رکھی لوہے کی الماری کا چھوٹا خانہ چابی سے کھول کر اس میں سے اپنی چادر نکالی تھی' جو ابا کے گھر سے نکلتے وقت میں اپنے ساتھ لیتی آئی تھی۔ یہ اماں کی چادر تھی۔ یہ ان کے پاس ان کی اماں کی نشانی تھی۔

نشانی سے محبت کا یہ سفر تکلیف دہ رہا۔ یہ ایک سہارے کی طرح تھا جو اماں نے ڈھارس کے لیے اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ وہ اکثر اس چادر سے لپیٹ کر رویا کرتی۔ نشانی کے اس سفر کو میں ایک نیا سفر دینے والی تھی.....میں نے چادر اوڑھ لی.....

میری ساس بکتی رہی۔ ''نکل جا حرافہ.....اب ہم تجھے پناہ دینے کے نہیں.....تو نے کیا سمجھا ہے ہر بار تو منہ اٹھا کر آ ے گی تو ہم تجھے بانہوں میں بھر لیں گے۔ تیرے گناہ چھپاتے پھیریں گے۔ تیری کالک اپنے منہ پر لیپ لیں گے۔ نکلو تم سب بھی یہاں سے کیا تماشا دیکھ رہے ہو.....دفعان ہو.....نکل.....''

میں باورچی میں گئی۔ یہاں ایک ڈبے میں نے کچھ پیسے چھپا کر رکھے تھے جو شکیل دے جایا کرتا تھا مجھے۔ جیسے ہی میں نے وہ نکالے ساس نے جھپٹ لیے۔

''کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائیو۔''

بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں نے اس سے زیادہ تیزی سے ساس کے ہاتھ سے واپس جھپٹ لیے۔

''اماں تو پرے ہو جا.....بھوکی ننگی کو لے جانے دے جو لینا چاہتی ہے۔''

چادر اوڑھ کر میں اوپر آئی۔ جہاں میرا چھ فٹی کمرہ اور کبوتروں کا گھڑا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس گھڑے میں کون گیا تھا.....جمیلہ.....اور اس گھڑے سے باہر کون آیا تھا.....''میں''.....

اس رات میں نے خود کو خود پیدا کیا تھا.....حقیقی خالق کے بعد میں اپنا خالق ہوں.....

جس وقت میں گھڑے کے پاس پہنچی۔ سفیدا جو آس پاس کی کبوتریوں پر نظر رکھے کھڑا تھا ایکدم سے تن کر کھڑا ہو گیا۔ اسے معلوم تو ہو گیا ہو گا کہ میں آئی ہوں۔ اس نے یہ اندازہ بھی لگا لیا ہو گا کہ میں اس کے قدموں میں گر کر معافی مانگوں گی۔ باپ کے گھر جانے سے تو رہی میں۔ اب مجھ جیسوں کا ٹھکانہ اور کہاں ہو گا.....اسی کا گھر نا۔

''میں بنت جمیلہ'' پورے ہوش وحواس میں سلیم عرف سفیدا ولد وزیر احمد کو بقائمی ہوش وحواس طلاق دیتی ہوں۔''

میں نے ہاتھ میں پکڑا قانونی طلاق کا کاغذ بھی اس کے منہ پر دے مارا۔میرے ساتھ آنے والے سارے مجمع کو سانپ سونگھ گیا۔اور کسی ایک چھوٹی سی بچی نے تالی بجائی۔

جس وقت میں گاڑی میں بیٹھ رہی تھی اس وقت بستی کے سبھی لوگ باہر کھڑے مجھے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

وہ سب نہیں جانتے لیکن میں جانتی ہوں کہ یہ انسان اس زمین کے لیے اہل نہیں ہیں..... یہ بستی اور ایسی ہر بستی جلد ہی تباہ ہونے والی ہے.....جلد.....بہت جلد.....

☆ ☆ ☆